

1392

# تذکرہ معاصرین

۲

مالک ام

مکتبہ جامعہ دہلی



**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi  
Preserved in Punjab University Library.**

**پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ  
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ**





# تذکرہ معاصرین

۱۹۷۲ اور ۱۹۷۳ء میں وفات پانے والے  
ادبائے کے حالات اور کلام

۲

مالک رام



مکتبہ جامعہ ملیہ  
دہلی

(C)

مالک رام ۶۱۹۷۶

129428

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمپیٹ  
جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵

شاخ

مکتبہ جامعہ لمپیٹ  
پرس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ

مکتبہ جامعہ لمپیٹ  
اردو بازار - دہلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمپیٹ  
یونیورسٹی مارکیٹ - علی گڑھ ۲

بار اول ۶۱۹۷۶

قیمت ۱۳ روپے

تعداد - ۱۱۰۰

(جمال پرنٹنگ پریس - دہلی)

پروفیسر مختار الدین احمد

کی نذر



# تعارف

مذکرہ معاصرین کی پہلی جلد ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اس میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کے پانچ برس کے اموات کا ذکر تھا۔ یہ دوسری جلد ان ادبا کے حالات کو محتوی ہے، جنہوں نے ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دوران میں رحلت کی۔ ان مرحومین کے حالات جمع کرنے میں بھی اسی طریقہ کار پر عمل رہا ہے، جس کی طرف پہلی جلد کے شروع میں اشارہ کر چکا ہوں۔

جن اصحاب سے میرے ذاتی تعلقات لمبے عرصے تک رہے، یا جن کے پسماندگان اور احباب نے دستِ تعاون بڑھایا، آپ کو ان کے حالات مفصل تر اور نسبتاً مکمل ملینگے۔ میری دلی خواہش تو یہی رہی کہ سب کے حالات یکساں شرح و بسط سے ہیٹا ہو جائیں، لیکن اس کی تکمیل محض میری کوشش پر منحصر نہیں تھی، ہر جگہ ضروری تفصیلات نہ مل سکیں۔ مجبوراً، جو کچھ میسر آ گیا، اسی پر صبر و شکر کرنا پڑا۔ پاکستان کے ادبا کے حالات جمع کرنے میں خاص طور پر دشواری پیش آئی۔ ایک زمانے سے وہاں کے احباب سے خط و کتابت کا رستہ بند ہے؛ یہاں ان اصحاب کے دواوین بھی نایاب ہیں، اور پاکستان سے ان کا حصول جوے شیر لانے سے کم نہیں، بلکہ وہاں بھی اب یہ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ اسی لیے آپ کو ان اصحاب کے حالات میں بعض ایسی تفصیلات نہیں ملینگیں، جن کے دینے کا دوسری جگہ التزام کیا گیا ہے۔ تاہم جو کچھ ہو گیا، یہ بھی بسا قیمت ہے۔

میں نے یہ حالات ریزہ ریزہ کر کے جمع کیے ہیں۔ مرحومین کے خاندان کے لوگوں سے



ان کے احباب سے، اخباروں، رسالوں سے، کتابوں سے — غرض کہاں تک گناؤں،  
 خاصی میں فہرست ہے۔ تمہیں زہر گوشہ یا نغم۔ میرے نزدیک ہر جگہ حوالے دینے کی ضرورت  
 نہیں۔ اصحاب اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں، میں ان پر بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ وہ  
 ان کا طریقہ کار ہے، یہ میرا۔ البتہ اگر کوئی صاحب کسی بات کا حوالہ طلب کریں، تو یہ نجوشی  
 پیش بھی کر سکتا ہوں۔

میں ان احباب کا شکریہ ادا کر چکا ہوں، جنہوں نے کسی نہ کسی طرح حالات کی فراہمی میں  
 یا دوا دین مہیا کرنے میں، یا اس جلد کی اشاعت میں دستِ تعاون بڑھایا۔ یہاں اسی  
 کا اعادہ کرتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان اصحاب کی توجہ شامل حال نہ ہوتی، تو یہ  
 جلد اس شکل میں منظرِ عام پر نہیں آسکتی تھی۔ فَاَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

مالک رام

نئی دہلی ۲۶ جنوری ۱۹۷۶ء

# فہرست

## بترتیب حروف تہجی

- ۲۱۴ : ابرار حسنی گنوری، احمد بخش،
- ۲۲ : انیم خیر آبادی، سید امیر احمد
- ۹۹ : احتشام حسین، سید:
- ۱۹۸ : اختر حیدر آبادی، سردار زکیم
- 
- ۴۰ : باقی ہمدانی، محمد افضل
- ۲۰۱ : بکر و محبوب، راجا محمد امیر احمد خان
- ۱۸ : بشیر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم
- ۲۱۴ : بگٹ و عظیم آبادی، غلام دستگیر خان
- 
- ۷۷ : پنہاں بریلوی، سپہر آرا خاتون
- 
- ۲۳۵ : تاب حیدر آبادی، عبداللہ بن احمد
- ۶۸ : تاج قریشی حیدر آبادی، محمد تاج الدین
- ۹۱ : تمنا عمادی مجیبی پھلواری، سید حیات الحق
- 
- ۱۹۳ : جذب عالمپوری، راگھوندر راؤ
- ۵۶ : جعفر حسن، (جافر حسن)
- 
- ۱۵۲ : حشر سیتاپوری، سید محمد کاظم
- ۱۲ : حفیظ ہوشیارپوری، عبدالحفیظ سلیم



- ۱۴۴ : حمید ناگپوری، عبدالحمید
- ۱۴۵ : ذاکر حسین فاروقی
- ۱۴۹ : سجاد ظہیر، سید :
- ۲۲۴ : سلام مچھلی شہری، عبدالسلام :
- ۱۸۴ : سید سنجی حسن نقوی
- ۱۳۵ : شوکت سبزواری، سید شوکت علی
- ۱۴۰ : ضیاء الیونی، ضیاء احمد
- ۵۷ : ظفر، سراج الدین ظفر
- ۱۳ : عادل رشید، محمد منظور الحق
- ۶۳ : عبدالستار صدیقی
- ۵۰ : علیم اختر مظفر نگری، محمد عبدالعلیم صدیقی
- ۱۲۰ : فرقت کاکوروی، غلام احمد
- 
- ۱۲۹ : گھر گور کھپوری، ایشوری پرشاد
- 
- ۸۰ : محمد اسماعیل پانی پتی
- ۱۲۹ : محمد اکرام، شیخ
- ۷۳ : مختار صدیقی، مختار الدین
- ۸۷ : مخفی، صالحہ بیگم
- ۱۳۲ : ممتاز شیرین
- 
- ۲۸ : ناصر کاظمی، ناصر رضا
- ۲۲ : یحییٰ اعظمی، محمد یحییٰ
- ۳۳ : یوسف ظفر، محمد یوسف

# فہرست

## بترتیب تاریخ وفات

صفحہ	تاریخ وفات	مقام وفات	نام / تخلص
۱۳	۳ جنوری ۱۹۷۲ء	بہمنی	عادل رشید، محمد منظور الحق
۲۰	۸ جنوری ۱۹۷۲ء	رادپنڈی	باقی صدیقی، محمد افضل
۱۸	۲۰ فروری ۱۹۷۲ء	حیدرآباد	بشیر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم
۲۲	۲۲ فروری ۱۹۷۲ء	اعظم گڑھ	یحییٰ اعظمی، محمد یحییٰ
۲۸	۲ مارچ ۱۹۷۲ء	لاہور	ناصر کاظمی، ناصر رضا
۳۳	۷ مارچ ۱۹۷۲ء	رادپنڈی	یوسف ظفر، محمد یوسف
۴۲	۷ اپریل ۱۹۷۲ء	خیرآباد	ایم خیر آبادی، سید امیر احمد
۵۰	۳۱ اپریل ۱۹۷۲ء	دلی	علیم اختر مظفرنگری، محمد عبدالعلیم صدیقی
۵۷	۷ مئی ۱۹۷۲ء	کراچی	ظفر، سراج الدین ظفر
۶۳	۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء	الہ آباد	عبدالستار صدیقی
۶۸	۵ ستمبر ۱۹۷۲ء	حیدرآباد	تاج قریشی حیدرآبادی، محمد تاج الدین
۷۳	۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء	لاہور	مختار صدیقی، مختار الدین
۷۷	۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء	کراچی	پنہاں بریلوی، سپہنہ آرا خاتون
۸۰	۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء	لاہور	محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ
۸۲	۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء	امروہہ	سید سخی حسن نقوی
۸۷	۲۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء	کلکتہ	مختفی، صالحہ بیگم



نمبر	تاریخ و وقت	مقام و وقت	نام / تخلص
۹۱	۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء	کراچی	تنہا مادی مجیبی پھلواروی، حیات الحق
۹۹	یکم دسمبر ۱۹۷۲ء	الہ آباد	سید اقسام حسین رضوی
۱۱۰	۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء	کراچی	حفیظ ہوشیار پوری، عبد الحفیظ سلیم
۱۲۰	شب ۱۲/۱۳ جنوری ۱۹۷۳ء	منگلسرے	فرقت کاکوروی، غلام احمد
۱۲۹	۷ جنوری ۱۹۷۳ء	لاہور	محمد اکرام، شیخ
۱۳۲	۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء	اسلام آباد	ممتاز شیریں
۱۳۵	۹ مارچ ۱۹۷۳ء	کراچی	شوکت سبزواری، سید شوکت علی
۱۴۵	۲۵ مارچ ۱۹۷۳ء	بہی	ڈاکٹر حسین فاروقی، ڈاکٹر
۱۴۹	۱۰ جول ۱۹۷۳ء	گورکھپور	گہر گورکھپوری، ایشوری پرشاد
۱۵۲	۷ جون ۱۹۷۳ء	سیتاپور	حشر سیتاپوری، سید محمد کاظم
۱۵۶	۲۵ جون ۱۹۷۳ء	خیدرآباد	جعفر حسن (جافر ہسن)
۱۶۴	۴ جولائی ۱۹۷۳ء	ناگپور	حمید ناگپوری، عبد الحمید
۱۷۰	۸ جولائی ۱۹۷۳ء	علی گڑھ	ضیاء الیونی، ضیا احمد (پروفیسر)
۱۷۹	۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء	الہ آباد (رو)	سجاد ظہیر، سید
۱۹۳	۲۸ ستمبر ۱۹۷۳ء	خیدرآباد	جذب عالمپوری، راگھوندر راؤ
۱۹۸	۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء	بنگلور	اختر خیدر آبادی، سردار بیگم
۲۰۱	۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء	لندن	بحر و محبوب، راجا محمد امیر احمد خان
۲۱۴	۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء	پٹنہ	بگٹ عظیم آبادی، غلام دستگیر خان
۲۱۶	شب ۸/۹ نومبر ۱۹۷۳ء	گنور	ابر حسی گنوری، احمد بخش
۲۲۴	۱۹ نومبر ۱۹۷۳ء	نئی دہلی	سلام محل شہری، عبدالسلام
۲۳۵	۲۴ نومبر ۱۹۷۳ء	خیدرآباد	تاب خیدر آبادی، عبداللہ بن احمد

## عادل رشید، سید محمد منظور الحق

داغ کے مشہور شاگرد نوح ناروی کا ایک شعر ہے:

جو آنا ہے ان کو تو، اے نوح! آئیں؛ وہ رستہ، طرف افاصلہ کچھ نہ پوچھیں

پڑھیں ریل پر، اور پہنچیں سرائتھو؛ سرائتھو سے نو میل دکھن ہے نار ا

یہ جغرافیہ اور محل وقوع انھیں اس لیے بتانا پڑا کہ ایک صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت! یہ نارہ کہاں ہے جس کی نسبت سے آپ ناروی کہلاتے ہیں؟ آپ جانتے ہیں، نوح ٹھہرے شاعر اور شاعر بھی ایسے کہ شعر ان کا تکیہ کلام تھا؛ انھوں نے جواب میں یہ شعر کہہ دیا۔ سائل کی تسلی ہو گئی۔ خدا کرے کہ آپ کی بھی ہو جائے اور آپ مجھ سے یہ نہ پوچھنے لگیں کہ ہم کونسے اسٹیشن سے ریل پر چڑھیں؟ اور سرائتھو کہاں ہے؟ میں شاعر نہیں ہوں اور نوح صاحب بھی ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو الہ آباد کو پیارے ہو گئے، ورنہ کہتا ان سے پوچھیے۔

تو نارہ کا یہ قصہ اس سے یاد آیا کہ عادل رشید بھی ۲۰ نومبر ۱۹۶۰ء کو اسی نارہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں ان کی ناکھیاں تھی۔ ان کے نانا ملا جی یہاں کے بہت بڑے پیر تھے۔ جب یہ پیدا ہوئے ہیں تو ان کے نانا ابا ترک دنیا کر چکے تھے، اور ان کے بیٹے سید شاہ حسام الدین احمد (عادل کے ماموں) مسند سجادگی پر رونق افروز تھے۔

عادل رشید کا اصلی نام محمد منظور الحق تھا۔ ان کے والد سید شاہ محمد فضل الحق ضلع الہ آباد کی تحصیل سرائتھو کے قصبے رشید پور کے جاگیر دار تھے۔ یہ جاگیر انھیں بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی، جہاں وہ اپنے آبائی مکان کڑا مانپور سے ہجرت کر کے آ بسے تھے۔ بزرگوں میں فضالت اور طبابت پشتوں تک رہی تھی چنانچہ عادل رشید کے پردادا اور پھر دادا سید شاہ محمد عبدالحق بھی اس علاقے کے مانے ہوئے حکیم تھے۔ دادا نے ان کے پیدا



ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ میں اپنے پوتے کو طب کی تعلیم دوں گا اور حکیم بناؤں گا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ دادا ابا کا سال بھر بعد ۱۹۲۱ء میں انتقال ہو گیا۔ والد (شاہ محمد فضل الحق) کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی؛ انھیں اپنی کھنتی باڑی کے علاوہ صرف انھیں چیزوں سے دلچسپی تھی، جن سے اس عہد کے دوسرے جاگیرداروں کو دلچسپی تھی اور ان میں کئی طرح کی بازیاں شامل تھیں۔ اس کے برعکس ان کی والدہ ماجدہ (امتہ الفاطمہ) پڑھنے لکھنے اور علم و ادب کا ذوق اپنے میکے سے ساتھ لاتی تھیں۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر ادیب اور مصنف بنے۔ ان کی تمنا اور دعا پوری ہوئی، لیکن افسوس کہ وہ اسے دیکھنے کو زندہ نہ رہیں! عادل صرف آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۸ء میں وہ رحلت کر گئیں۔ اس زمانے میں خاندان کانپور میں رہتا تھا۔

۱۹۳۱ء میں کانپور میں زوروں کا فساد ہوا تھا۔ شاہ محمد فضل الحق اس سے ڈر گئے۔ انہوں نے مستقبل کے موہوم خطروں سے بچنے کے لیے کانپور سے نقل مکان کر کے الہ آباد میں سونت اختیار کر لی۔ وہاں ان کے خاندان کے لوگ اپنے محلے دائرہ شاہ رفیع الزماں (حکیم بادشاہ) کے گویا مالک تھے۔ اس محلے میں "رفیع الزمان لائبریری" نام کا ایک دارالمطالعہ تھا، جس میں اردو کے کئی مشہور رسالے اور جرائد آتے تھے۔ عادل نے اگرچہ علم و ادب کا ذوق اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا، لیکن اس ذوق پر چلا نہیں ہوئی۔ وہ باقاعدگی سے اس لائبریری میں جاتے اور یہاں رسالوں کا مطالعہ کرتے۔ اسی سے بڑھ کر انھیں خود بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ "قرض" کے عنوان سے کانپور کے رسالے "مستورات" کے خاص نمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔

اس افسانے تک وہ سید محمد منظور الحق میٹھی تھے۔ عادل تخلص اور رشید میٹھی وطن سے نسبت ادنیٰ ملا بست۔ لیکن بعد کو دیکھا کہ نسبت کبھی رشید میٹھی چھپ جاتی ہے، کبھی رشید میٹھی، تو انھوں نے اسے یکسر اڑا دیا؛ اور صرف عادل رشید بن گئے۔ بعد کے زمانے میں وہ اس نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ

آج شاید ہی کوئی ان کا اصلی نام محمد منظور الحق جانتا ہو۔ شروع میں وہ بہت دن تک نعت اور قوالی لکھتے رہے۔ اس زمانے میں ان کے چند گانوں کے ہزاسٹریس و اس کمپنی نے گراموفون ریکارڈ بھی تیار کیے تھے۔

۱۹۳۵ء میں وہ والدہ کے سلوک سے، جنہوں نے دوسری شادی کر لی تھی، تنگ آ کر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، حال آں کہ وہ اس زمانے میں اسلامیہ انٹر کالج میں زیر تعلیم تھے اور اس کی تکمیل کی منزل ہنوز بہت دور تھی۔ وہ پہلے بریلی گئے یہاں اس زمانے میں ایک ماہنامہ ”شاہد“ شائع ہوتا تھا۔ ساحر قدوائی (حال ڈاکٹر ساحر بریلوی، لائل پور، پاکستان) اس کے مالک اور مدیر تھے۔ عادل رشید اس رسالے میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں ساحر صاحب اس رسالے کو ساتھ لے کر دلی آئے، تو عادل بھی ان کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ یہاں ان کا تین برس قیام رہا۔ اسی دوران میں انہوں نے یہاں کے ہفتہ وار پریچے ”جمیل“ کی ادارت بھی کی۔ بالآخر انہوں نے ۱۹۴۰ء میں قسمت آزمائی کرنے کو بمبئی کی راہ لی۔ ادھر ساحر نے دیکھا کہ وہ اکیلے ”شاہد“ کو نہیں چلا سکتے۔ انہوں نے پریچہ عادل کے سپرد کر دیا، اور خود ایس بریلی چلے گئے۔ عادل بمبئی پہنچے، تو انہوں نے اسے ہفتہ وار کر دیا اور وہیں سے شائع کرنے لگے۔

بمبئی بڑا غدار شہر ہے۔ اگر کسی شخص کو دنیا کمانے کا خاص فن نہیں آتا، تو اس کے لیے بمبئی میں کامیابی حاصل کرنا محال نہیں، تو بہت مشکل ضرور ہے۔ عادل بھی اس فن سے نابلد تھے۔ لہذا انہیں بھی ہر طرح کی مشکلات سے گزرنا پڑا، جن میں فاقے اور رات کو بازار کی پٹری پر سونا بھی شامل ہے۔

اس زمانے میں یہاں بمبئی میں ایک صاحب تھے سلطان حسین۔ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے، لیکن کتابیں چھاپنے اور ان کے بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ (سلطانی پریس) تھا؛ اس کے علاوہ لکڑی کا بیوپار بھی تھا۔ غرض بہت کامیاب تاجر تھے۔ عادل کی ان سے دوستی ہو گئی، اور رفتہ رفتہ وہ تجارت میں ان کے شریک

بن گئے۔ انھوں نے ”شاہد“ بھی سلطان حسین صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس زمانے میں ”شاہد“ کا دفتر ترقی پسند مصنفین کی تحریک کامرکز بن گیا۔ بمبئی کے جتنے ادیب و شاعر تھے، وہ عادل کے دوست اور ”شاہد“ کے دفتر کے مستقل حاضر باش تھے۔ سلطان حسین بھی عادل کو بہت مانتے تھے، چنانچہ ان کی وساطت سے بہت سے مصنفوں کو سلطان حسین صاحب سے مالی امداد ملی۔ عادل نے خود بھی کسی زمانے میں ایک انجمن صداقت پسند مصنفین قائم کی تھی۔ وہ اس کے صدر تھے؛ حیات و ارثی اس کے سکتر تھے۔

لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کے خلاف پولیس آکشن ہوا۔ خدا معلوم، کس نے سلطان کے خلاف رضا کاروں کی امداد کرنے کا اتہام لگایا۔ بس، پھر کیا تھا، سلطان حسین گرفتار کر لیے گئے۔ تین دن حوالات میں رہے۔ آخر کار کمرشن چندر اور عادل رشید انہیں ضمانت پر رہا کر لائے۔ یقیناً پر الزام غلط ثابت ہوا، اور وہ بقیہ صورت قرار پائے۔ لیکن اس تین دن کی حوالات نے ان کے اوسان خطا کر دیے۔ انھوں نے اسے اپنی انتہائی توہین اور ذلت تصور کیا۔ چنانچہ بمبئی کا سارا جما یا کاروبار چھوڑ کر راجی چلے گئے۔

سلطان حسین کے بمبئی سے جانے کے ساتھ ہی عادل رشید کا ادبار بھی شروع ہوا۔ ان کا اپنا ماہانہ پرچہ ”حجاب“ اور ”آنتہاری“ کلمی جو انھوں نے کسی زمانے میں چلائی تھی، وہ پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ اب ”شاہد“ بھی بند ہو گیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا عزیز ترین دوست ان سے کھیر گیا۔ ان کے بھلے دنوں کے تمام دوست پیٹھ دکھا گئے اور کسی نے جھوٹوں بھی ان سے نہ پوچھا کہ بھائی، کس حال میں ہو، نسبت فاقوں تک پہنچی لیکن آفریں ہے ان کی ہمت، مردانہ پر کہ وہ انتہائی مخالف حالات میں بھی اپنے آپ سے مایوس نہیں ہوئے۔

اب انھوں نے قلم کا سہارا لیا۔ ان کے ناول مینہ کی طرح برسے لگے۔ ہر مہینے نیا ناول کسی مہینے رو رو بھی۔ ان کے کم و بیش ڈیڑھ سو ناول شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا ملک کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ وہ آخر تک اپنے قلم کی کمائی کے سہارے عزت و آبرو سے جینے۔

صحت بالعموم اچھی رہی، لیکن آخر کار مسلسل کثرت کار نے اپنا اثر دکھایا، کبھی کبھی بیمار بھی

ہو جاتے تھے۔ اسی طرح کی کچھ شکایت محسوس کی، تو علاج کے لیے ناناوتی اسپتال (کہنئ) میں چلے گئے۔ وہیں پیر کے دن ۳ جنوری ۱۹۷۲ء صبح کے اڑھتھیں بجے دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کیا اور اسی شام جوہر کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

عادل نے ۱۹۴۱ء میں عذرا بیگم سے شادی کی تھی۔ عذرا بیگم ان الارشد (حال مدیر ماہنامہ الشجاع، کراچی) کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ ارشد کھانوی ان کے ماموں تھے، شوکت کھانوی بھی رشتہ میں ماموں ہوتے تھے۔ اس نیک بیوی نے عادل کا ہر حال میں ساتھ دیا۔ ان کے چھ بچے ہیں، چار بیٹیاں (ناہید اور نسیم اور نسری اور شاہینہ تنویر) اور دو بیٹے (جاوید اور گلریز)



## بشیر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم

ان کا خاندان دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ہجرت کر کے دکن میں جا بسے تھے۔ بشیر کے والد مولوی عبدالرحمن ریاست حیدر آباد (دکن) کے محکمہ سیاسیات میں مددگار (اسٹنٹ) کے عہدے پر فائز تھے؛ اور والدہ شمس النساء بیگم، میرزا صادق علی بیگ تعلقدار کی بھانجی تھیں۔ اموں نے بھانجی کی تعلیم و تربیت اپنی نگرانی میں کی۔ وہ خود اپنی علم دوستی، فیاضی اور درویشانہ عادات و صفات کے لیے مشہور تھے۔ شمس النساء بیگم نے جو اس ماحول میں تربیت پائی، تو یہی خصوصیات ان کے کردار کا بھی جزو بن گئیں۔ وہ بہت اچھی خوشنویس تھیں اور خطابت میں بھی ان کا شہرہ تھا۔

بشیر ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم ہر اس سخی طور پر ہوئی۔ فارسی کی تحصیل بہت حد تک اعلیٰ درجے کی تھی یونہی ہی قرآن با معنی، تفسیر کے ساتھ پڑھا تھا۔ اردو اور فارسی شعرا کا کلام تعلیم کے دوران میں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ چونکہ حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا، اس لیے اس کا بیشتر حصہ یاد میں محفوظ رہ گیا، اور پھر اسی سے خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ جلد ہی کلام دلی کے مختلف رسائل ”عصمت“، ”ساقی“ وغیرہ میں چھپنے لگا۔ مشابہ میر دکن نے بھی ان کی بہت مولانا انزانی کی۔ وہاں کے زمانہ رسائل ”شہاب“، ”ناہید“ وغیرہ نے ان کی پذیرائی کی۔ نفاست طبع کے ساتھ شعر و سخن کے اسی شغف کے باعث خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف جولائی ۱۹۵۵ء) نے انہیں ”چمن آرا“ کا خطاب عطا کیا تھا۔

شروع میں مہاراجا کشن پرشاد (ف ۱۹۴۱ء) کے درباری شاعر صادق حسین غبار سے مشورہ کیا۔ غبار نے جلد ہی کہہ دیا کہ کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔ ان کے بعد سید علی حیدر نظم طباطبائی (ف

۱۹۳۳) اور اپنے والد کے دوست ابو ظفر عبدالواحد صاحب سے بھی کچھ استفادہ کیا تھا۔

وہ مدتوں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے شعبہ نسواں کی نائب معتمد رہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم (ف ستمبر ۱۹۶۲) کو ان سے ہمیشہ پر اتعاون ملا اور وہ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دکن میں عورتوں کی تعلیم و ترقی میں ان کی مساعی بہت قابل قدر تھیں۔

ان کا مجموعہ کلام "آبِ کینہِ نغمہ" بھی ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) کی طرف سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، اس میں مذہب اور اخلاق کا جو مقام تھا، ناممکن تھا کہ وہ اس سے متاثر نہ ہوتیں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں کئی حمد و نعت پر متعدد نظمیں ملتی ہیں۔ یوں بھی انھیں غزل کی یہ نسبت نظم سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس دور کے شاعروں میں وہ اقبال سے بہت متاثر تھیں۔ انھیں بزرگان دین سے والہانہ عقیدت تھی؛ اور ان کی بعض معرکے کی نظمیں اسی جذبے کی مظہر ہیں۔ نظم کے علاوہ نثر سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔

۱۹۳۶ء میں مرزا ضامن علی صفوی غازی میر عمارت اور ٹھیکیدار سے نکاح ہوا۔ اتفاق سے وہ بھی ہم مشرب نکلے۔ غازی صاحب کے والد (یعنی بشیر کے خسر بزرگوار) مرزا اکرام علی صفوی کبھی شعر کے رسیا اور سخن شناس بزرگ تھے۔ انھوں نے بشیر کے ذوق شعری کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں گھریلو پریشانیوں سے بیفکر کر دیا۔ اس سے بشیر نے بہت فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے اولادِ جسمانی میں صرف ایک صاحبزادہ (راشد علی صفوی) اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

صحت بہت دن خسر رہی۔ اسی میں یکشنبہ ۲۰ فروری ۱۹۴۲ء (۴ محرم ۱۳۶۲ھ) بعد مغرب حیدرآباد میں رحلت کی۔ جنازہ اگلے دن ۲۱ فروری کو اٹھا۔ نماز جنازہ مسجد شطاریہ (دیر پورہ) میں ادا ہوئی اور انھیں قبرستان ملک پیٹ (مقابل ٹیپہ خانہ صحیفہ) میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ ○ قبر کے لیے ان کے جان نثار شوہر غازی صاحب نے سنگ مرمر اور سنگ سیاہ کا خوبصورت تعویذ تیار کرایا ہے۔

بہت لوگوں نے تاریخ و فنات کہی حکیم محمد خواجہ شفیع حسن عارف (ابوالعلائی آغانی) کے  
تعلقے کا آخری شعر ہے۔

ندا آئی رضوان سے، عارف! یہی

کہ کہ دو: ٹھکانہ ہے خلد بریں

(۱۳۹۲)

اب کلام کا نمونہ دیکھیے، جو ”آبگینہ شعر“ سے ماخوذ ہے: پہلے دو نظموں میں اور پھر نثر کے

چند شعر:

## نجم سحر

نجم سحر! بتا، تجھے اللہ کی قسم!  
چھپتے نہیں چھپاتے ہے اندازِ سوز و غم  
تاروں کے قافلے گئے، رخصت ہوا قمر  
افسردہ کس کی یاد میں اب تک کھڑا ہے تو؟  
کس سوچ میں ہے تو کہ بڑھانا نہیں قدم  
اس درجہ کیوں ادا اس ہے، اے پیکرِ اہل  
شب زندہ دار ہو گئے، دنیا سے بن خیر  
ہاں، کن تو تہمت میں الجھا ہوا ہے تو؟

اے بن خیر! خبر ہے مجھے تیرے حال کی

معلوم مجھ کو وہ ہے تیرے سلال کی

یہ خوفِ مرگ، جس سے ہے لرزاں تیرا وجود  
تا اب یہ کائنات ہے، میرے جنون کی  
تو چاہتا ہے دیکھنا، کیا ہو گا اب یہاں  
وہ دیکھ کر نہیں آتی ہیں، کیا دور دور سے  
پھر نرم ہو گی کل کی طرح بزمِ کائنات  
سورج غروب ہو گا تو پھر شام آتی سیگی  
میرے جنونِ شوق میں، ہے خواہشِ نمود  
بود و نبود میں ہے کششِ کاف و نون کی  
بے انجم و قمر، نظر آئیگا کیا جہاں!  
دنیا چمک اٹھی شہِ خاور کے نور سے  
گردش کرینگے جامِ اجل، ساغرِ حیات  
تاریک رات پھر وہی جادو جگا تیگی

قائم نظامِ دہر، تنوع کے بل پہ ہے

ثابت قدم وہی ہے، جو خداں اجل پہ ہے

## رُبابِ حیا

موج بقا کہیں، کہیں نقشِ ثبات ہے ہر سمت نغمہ ریز، رُبابِ حیات ہے

دنیا طلسم گاہِ حیات و موات ہے  
معمورہ جنوں میں نہ دن ہے نہ رات ہے  
دل بارگاہِ کتاب و تب و ادرات ہے  
لیکن محیطِ دہرا وہی ایک ذات ہے  
دنیا ئے انبساط کی تار یک رات ہے  
تنویرِ روحِ عکس ہے حسنِ دوام کا  
ہر لحظہ ایک عالمِ نو کا ظہور ہے،  
ذوقِ نظر سے باقی ہے یہ حسنِ کائنات  
پوشیدہ گونگا ہوں سے ہے دہر آفرین  
ٹوٹی ہوئی امیدوں کی غمتاں ک داستاں

افسانے بن رہے ہیں عروج و زوال کے

صورتِ گر حیات، آلِ حیات ہے

گوشکوار سچ گردشِ دوران نہیں ہیں ہم  
بیزار ابل بزم ہیں، ساتی ہے بدگماں  
تفس میں چین سے، اے ہم صغیر! اپنے دے  
گیا ہے روش، تو فرما بھی آنے والا ہے  
بشیر! زندگی جاوداں ہے موت کے بعد  
ہے رات کی سیاہی بھی تمہیدِ صبح کی  
یارب! تو لاج رکھ لے چینِ نیاز کی  
عبث، سنا سنانا ہے فسانہ دردمندوں؟  
ذوقِ نثار ہو، تو گلستاں میں، بشیر!  
ہوتی ہے وقت ہی پر اپنے پر ایسے کی تمیز  
زندگی گھر گئی ماحولِ پریشیاں میں، بشیر!

پیر کیا کہیں کہ دل ہے کہیں اور کہیں ہیں ہم  
مغفل میں یوں شریک ہیں جیسے نہیں ہیں ہم  
فسانہ ہاے چین، ذکرِ آشیاں کب تک  
زبانِ حال پر ماضی کی داستاں کب تک  
یہ جاوداں تھی، لیکن یہ جاوداں کب تک  
غم ہو کہ انبساط، نہیں حسا وداں کوئی  
ہے تیرے آستاں کے سوا آستاں کوئی؟  
کہ صبرِ شکر کا اک نام مجبوری بھی ہوتا ہے  
ہر شجر قابلِ اظہارِ نظر آتا ہے  
ورنہ بدخواہ بھی غمخوارِ نظر آتا ہے  
ہر بشر پیکرِ افکارِ نظر آتا ہے



## سیدی اعظمی، محمد یحییٰ

ان کا آبائی وطن قصبہ بہاراج گنج (ضلع اعظم گڑھ) تھا، جہاں وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً ۱۹۱۹ء میں انھوں نے مقامی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد فارسی کی تعلیم اپنے والد مولوی ضیا اللہ سے پائی۔ مولوی صاحب موصوف پرانے طرز کے مدرس اور اردو اور فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کی اردو اور فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ سیدی صاحب نے ان کی تعلیم سے پورا استفادہ کیا۔ بلکہ جب زمانہ تعلیم کے دوران ہی میں انہیں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو کلام بھی والد ہی کو دکھایا۔ انھوں نے جوصلہ افزائی بھی کی اور کلام پر اصلاح بھی دی۔

۱۹۲۰ء میں ہماری سیاسی تحریک نے نیا موڑ لیا تھا۔ خلافت تحریک بھی اپنے پورے شباب پر تھی۔ نوجوان سیدی بھی اس میں شامل ہو گئے۔ دراصل ان کی قومی اور ملی شاعری کا منبع یہی سیاسی تحریکیں ثابت ہوئیں۔

جون ۱۹۲۵ء میں بعض احباب اور بزرگوں کی وساطت سے وہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق انھوں نے عمر بھر نبایا۔ یہیں کے قیام کے دوران میں انھوں نے پرائیوٹ طور پر دسویں درجے کا انگریزی امتحان بھی پاس کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی باقاعدہ تعلیم کسی درس گاہ کی مرہونِ منت نہیں تھی۔ اپنے وطن کے مڈل اسکول کا تعلق بھی برائے نام رہا۔ جیسا کہ خود انھوں نے ایک مرتبہ بتایا تھا، انھوں نے جو کچھ بھی پایا، گھر کی تعلیم سے۔ اردو، فارسی کا ذوق ذاتی مطالعے اور فاضل بزرگوں اور شفیقوں کے فیضِ صحبت اور حسن تربیت کا نتیجہ تھا۔

129428

دارالمصنفین میں انھیں جو فہما میسر آئی، یہ سراسر علمی اور ادبی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (ف ۱۹۵۳ء) کی صحبت میں ان کے ذوقِ شعر گوئی نے بہت ترقی کی۔ اب وہ برابر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ غالباً ان کی سب سے پہلی نظم جو "معارف" میں شائع ہوئی، وہ غازی نادر شاہ مرحوم والی افغانستان کے حادثہ قتل (۸ نومبر ۱۹۳۲ء) سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ یہ خطاب بملتِ افغان کے عنوان سے "معارف" کے دسمبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شامل ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ افغانستان کے مشہور مہندستان دوست شاعر سرو رضا صاحب نے کیا تھا جو ان کے اپنے جواب کے ساتھ وہاں کے رسالے "کابل" کی اشاعت ۶ جنوری ۱۹۳۴ء میں چھپا تھا۔ یحییٰ اعظمی نے پھر اس کا جواب فارسی میں لکھا جو "معارف" کی اشاعت مارچ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا ہے۔

اپنی قومی اور سیاسی شاعری کے باعث وہ قوم پرور طبقے میں رزقِ متعارف تھے، بلکہ خاصے مقبول تھے۔ چنانچہ ان کے کلام کا مجموعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (ف سنی ۱۹۶۹ء) کے ایما پر "نوائے حیات" کے عنوان سے حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے شروع میں مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین، اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔

کلام کا دوسرا مجموعہ "نوائے عصر" بھی جنوری ۱۹۴۰ء میں اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ پیش نلفظ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا ہے۔

یحییٰ اعظمی مرحوم شبلی اکول کے شاعر تھے اور ان کے ذوقِ شعری کی تربیت میں اقبال احمد سہیل کا بہت ہاتھ تھا۔ شبلی (ف نومبر ۱۹۱۴ء) اور سہیل (ف نومبر ۱۹۵۵ء) کا جتنا کامیاب اتباع انھوں نے کیا ہے، وہ کسی سے نہ ہو سکا! ان کے دونوں مجموعے اس دعوے پر شاہدِ عادل ہیں۔ انھوں نے رجالِ عصر سے متعلق جو نظمیں کہی ہیں اور ان میں کلام کا جو شکوہ ہے، اس سے ان کی قدرتِ زبان، فارسی میں درکِ فن کی ہمارے ایک ایک مصرعے سے نمایاں ہے۔

شاعر کے علاوہ، ذاتی طور پر بھی وہ بہت اچھے انسان تھے؛ درویش صفت اور منکسر

مزاج اور قناعت کا مجسمہ۔ دارالمصنفین کی نوکری سے جو تنخواہ انھیں ملتی تھی، وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کو کبھی بمشکل ہی کفایت کرتی ہوگی۔ لیکن اللہ کے اس نیک بندے نے ہر شکر سے اسی میں ساری عمر بسر کر دی۔

انھیں جگر کی خرابی اور فشارِ دم کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ آخر میں عیسٰی بول کے دورے پڑنے لگے۔ اسی میں کوئی دو ہفتے کی علالت کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۷۲ء چار بجے شام رحلت کی۔ تدفین اگلے دن ۲۳ فروری صبح کے دس بجے ہوئی۔ نمازِ جنازہ حکیم محمد اسحاق صاحب نے پڑھائی اور اعظم گڑھ شہر کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اپنے پیچھے جسمانی اولاد میں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑے۔

دیکھا جائے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ میا دی طور پر بھی غزل کے شاعر نہیں۔ ان کے جوہر نظم میں جھلکتے ہیں اور فارسی کی پیر شکوہ ترکیبوں اور قدرتِ زبان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اگر انھیں قصیدہ یا جزئیہ لکھنے کی ضرورت پیش آتی، تو اس میدان میں شکل ہی سے کوئی ان کا حریف ثابت ہو سکتا تھا۔ انھیں زیادہ شہرت اس وجہ سے نہیں مل سکی کہ وہ پراگندے کے ذرائع سے محتجب رہے۔ لیکن ہے اعظم گڑھ کے مقامی اجتماعوں یا مشاعروں میں کبھی شریک ہوتے ہوں، لیکن وہ باہر نہیں جاتے تھے۔ رسالے میں کبھی اپنے کلام نہیں بھجوتے تھے۔ تاہم اہل نظر کے حلقے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ نمونے کے طور پر کچھ کلام دیکھیے۔

### آہ اقبال

یونہی ہوتے رہینگے حشر تک شام و صبح پیدا	نہ ہوگا اب مگر اقبال سا صاحب نظر پیدا
ملا تھا تجھ کو جو روزِ ازل فیضانِ فطرت سے	کہاں ہر پیکرِ خاکی میں وہ سوزِ جگر پیدا
نہ اٹھا پھر کوئی رمزِ "انا" کا عارفِ کامل	ہوا اتھا ایک تو ہی خود شناس و خود گر پیدا
تریا ہی رہیگا ذرہ ذرہ خاکِ مشرق کا	تری معجز نوائی نے کیا ہے وہ اثر پیدا
دیا ہے آب و گل کو تو نے وہ دہرِ پرفشانی	کیے ہیں قطرہ رشتم نے کبھی اب بال و پر پیدا
کیا ملت کو پھر رزقِ یقین سے آشنا تو نے	ترے دم سے ہوئی پھر چشمِ باطن میں نظر پیدا

ہوتیں تجھ سے نوائے صبح میں کیفیتیں پیدا  
دلِ درد آشنا میں لذتِ آہِ سحر پیدا  
زمرتا پائیں، مستِ خوری، وقفِ خود آگاہی  
کہاں اب دہریں ہوتے ہیں ایسے باخبر پیدا

”ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے  
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و رو پیدا“  
علمائے سلف اور علمائے دورِ حاضر

اور  
ہنگامہ تکفیر

بلادیتا تھا اک عالم کو شورِ لا تحف ان کا  
قیامت تھا جہا حق میں رہنا سر بکف ان کا  
انہیں شایانِ شاں تھا وارثِ علم نبی کہنا  
کہ تھا خلقِ حسن، سرمایہٴ مجد و شرف ان کا  
سبتی دیتے تھے صحیح و خیر کا افراد امت کو  
ضیا انگن تھا فیضِ علم و عرفاں ہر طرف ان کا  
نوائے دعوتِ حق لے کے وہ جس دم نکلتے تھے  
تو خود کرتا تھا باطل خیر مقدم صرف ان کا  
قیامت ہے، اگر اس دور میں اخلاق کے ہاتھوں  
اب ان کی مسندِ ارشاد پر وہ لوگ بیٹھے ہیں  
بزرگوں سے ملی تھی جو متاعِ بے بہا، کھودی  
وہی ہے ابر نیساں اب بھی مصروفِ گہر باری  
فقط لے دے کے، ہے اک مشغلہ تکفیر کا جاری

مسلمانوں کی جان و دین و ایماں ہیں ہدف ان کا

متاعِ دو جہاں کونین کا حامل سمجھتے ہیں  
ازل سے ہم بجز اللہ دل کو دل سمجھتے ہیں  
جمالِ عشق کی نیرنگیوں کو دیکھنے والے  
نہا رتیس کو بھی روکشِ محمل سمجھتے ہیں  
دلِ درد آشنا کیا ہے؟ عطیہ فیضِ نطرت کا  
اُسے دیتے ہیں، جس کو جو ہر قابل سمجھتے ہیں  
جبینِ شوق کو مطلوب ہے بس نقشِ پاؤں کا  
نشانِ ماسوا کو ہم خطِ باطل سمجھتے ہیں

کہاں موجِ نسیمِ صبر کی یہ عنبر افشانی  
کوئی نکتہ ہم اس میں اور بھی شامل سمجھتے ہیں



کر لیں اب شامِ غم کو ہم رنگیں  
 کر لیں خوں چشمِ اشکبار سے ہم  
 کیا کھلیگی کبھی یہ دل کی کلی!  
 خوش ہوں کیا آمدِ بہار سے ہم  
 لاتے ہیں اک بہارِ داغِ جنوں  
 ہو گئے لذتِ آشنائے نشاط  
 ارمنانِ حسن کے دیار سے ہم  
 تلخی جو رہ روزگار سے ہم  
 لاکھ وعدہ وفانہ ہو، پھر کبھی  
 مست ہیں کیفِ اعتبار سے ہم  
 باز آئینگے جانِ زار سے ہم  
 دل میں کیا کیا لیے ہوئے اکٹھے  
 آستانِ حریمِ یار سے ہم

ہیں باندا ز شوقِ مست و خراب

لذتِ کیفِ اعتبار سے ہم

لکھنؤ

دے بگزار لے دورِ فلک! اما لکھنؤ بیستم  
 خوشا شہرے کہ برخاکش سوادِ خلد می ز قہد  
 بہارِ مرغزارش دامنِ دل می کشد این جا  
 تومی گوئی چمن اندر چمن، ہر رنگدرباشد  
 ہمہ شہرست آری مرغزارِ حسن و رنگینی  
 چہ می گویم، چہ کارِ مشکلی افتد نگاہم را  
 بے زبید، اگر این شہر را رشکِ ارم خوانم

بچشمِ آرزو آں مرغزارِ رنگ و بوسینم  
 چہ فردوسے کہ در باغش بہشتِ آرزو بیستم  
 ز بس ہر سمت جوشِ سبزہ و فیضِ نموبینم  
 تومی گوئی، ختن اندر ختن، ہر کاخ و کوبینم  
 بہارِ سبزہ و سرو و صنوبر چار سو بیستم  
 چوں ہر جانب ہجومِ شاہدانِ لالہ رو بیستم  
 کہ خاکِ عنبرینش را سراپا رنگ و بوسینم

نگشتم سیر در دا، از بہارستانِ رنگینش

ہنوزم آموزد باشد کہ دیگر لکھنؤ بیستم

طاکر را دھا کرشنن

روشن ہے جس سے مشرق و مغرب میں نام ہند  
 ہے جس کے دم سے رہیں اونچا مقام ہند  
 دانشورانِ عصر میں ہے احترام ہند

وہ فاضلِ یگانہ و دانشورِ عظیم  
 خاکِ وطن کا مایہ صد نازِ فلسفی  
 وہ جس کے فیضِ فلسفہ و علم و فضل سے

وہ جس کے دستِ فن نے سنوارا ہے مرقوں  
 وہ جس کی موجِ نکبتِ تحقیق و فکر سے  
 جس کا کمالِ علم، ہے رشکِ حبالِ عصر  
 جس کی حیاتِ خدمت، ملت کی نذر ہے  
 تبریکِ تہجد کو وقت کی جمہوریت! کہ آج  
 روئے نگارِ صبحِ وطن، زلفِ شامِ ہند  
 ہر دور میں رہا ہے معطرِ شامِ ہند  
 جس کا جمالِ فکر، ہے فخرِ عظامِ ہند  
 ہے جس کی ذاتِ مرجعِ اہلِ عوامِ ہند  
 اک فلسفی ہے صدرِ نشینِ نظامِ ہند

وہ صدر، جس سے دہریں ہے عظمتِ وطن  
 جس کا شمار ہے ادب و خدمتِ وطن

## ناصر کاظمی، ناصر رضا

اگرچہ کچھ موروثی زمینداری بھی تھی، لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے خاندان میں سپاہگری اور فوج کی ملازمت پشتوں سے چلی آتی تھی۔ چنانچہ ان کے والد محمد سلطان بھی فوج میں سویب رار مقرر تھے۔ بزرگوں کا وطن ابنا لہ شہر تھا، اور یہیں ناصر صاحب ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم ایف اے تک پائی، دسویں درجے تک اپنے وطن میں اور انٹرمیڈیٹ کالج لاہور میں۔ بی اے میں تعلیم پارہے تھے کہ بوجہ امتحان دینے سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ چھاڑ، واپس ابنا لہ چلے گئے۔ یہاں دو ڈھائی سال گھر کی زمینداری کا کام دیکھنے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پھر لاہور چلے گئے اور اس کے بعد اسی شہر کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ اولاً چندے ایک نیم سرکاری دفتر میں نوکری کی تھی۔ لیکن ان کا مزاج ادبی تھا، یہاں دل کیسے لگتا، چنانچہ سال بھر بعد اوراقِ نو، ماہنامے کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ تین برس تک یہاں کام کیا اور ۱۹۵۲ء میں مشہور رسالے 'ہمایوں' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ پھر آخر تک یہیں رہے۔

انہوں نے شاعری طالب علمی کے زمانے میں شروع کی تھی۔ اس دور میں ان پر میر اور فانی کا گہرا اثر تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب دوسرا دور شروع ہوا، تو وہ فانی کے جنگل سے آزاد ہو گئے۔ اب انہوں نے حفیظ ہوشیار پوری سے اپنے کلام پر اصلاح لینا بھی شروع کی۔

۱۹۵۵ء کے لگ بھگ انہوں نے غزل میں وہ رنگ اختیار کیا، جو مسلسل غزل اور نظم سے فریتر تھا۔ اب خیالات میں نچنگی آگئی تھی یہی اسلوب آخر تک قائم رہا۔ وہ میر کے

کامیاب تبیح کہے جاسکتے ہیں۔ وہی جذباتی دھیما پن اور کسک اور سپردگی کا ہجہ اور انداز جو میر کی خصوصیت ہے۔ لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی تھی۔ میر کے علاوہ ان پر ہندی شاعری بالخصوص دو ہے کا بھی نمایاں اثر تھا۔

ان کے کلام کا انتخاب برگ نے، کے عنوان سے پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ابتدائی زمانے کے چند شعروں کے علاوہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۲ء کا کلام شامل تھا۔ جب کتاب دوسری مرتبہ (۱۹۵۷ء میں) شائع ہوئی، تو اس میں ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء کا انتخاب بھی اضافہ کر دیا گیا۔ وفات کے سال کے بعد دوسرا مجموعہ کلام 'دیوان' کے عنوان سے شائع ہوا۔ تیسرا پہلی بار ۱۹۷۵ء میں چھپا، اس میں بیشتر مسلسل غزلیں ہیں۔

۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا، اور ان کے ساتھ اردو کا ایک نختہ کار، روایت کا پابن، و ضعداری کا دلدادہ شاعر ہم سے جدا ہو گیا۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی	برہم ہوتی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
اے دل! کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب!	ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی
اے دوست! ہم نے ترکِ محبت کجا وجود	محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی
پُر سناں نہ تھا کوئی، تو یہ رسوائیاں نہ تھیں	ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی
دورِ خزاں میں یوں مرے دل کو قرار ہے	میں جیسے آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی
کیا دن تھے، جب ہمیں میں خزاں بھی بہا تھی	یوں اپنا گھر بہار میں دیراں نہ تھا کبھی
یے کیف و بے نشاط نہ تھی اس قدر حیات	جینا اگر چہ عشق میں آساں نہ تھا کبھی
اس پیکرِ ناز کا فسانہ	دل ہوش میں آئے، تو سنائے

ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا	یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہل دنیا نے
ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اٹتا ہے	مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

بہ بھی کیا شامِ ملاقات آئی	لب پہ مشکل سے تیری بات آئی
----------------------------	----------------------------

بچ سے چپ ہیں ترے ہجر نصیب	ہائے، کیا ہوگا، اگر رات آئی!
---------------------------	------------------------------



ناز بیگانگی میں کیا کچھ تھا

کتنے بیتے دنوں کی یاد آئی

زمانہ پریشانی غم بھی کرے، تو کیا حاصل

تو ہی بتا، ترے بے خانماں کدھر جائیں

تسلیم زندگی، نہ دردِ فراق

بیٹھے بیٹھے تاروں کا سفر ختم ہوا

سایے کی طرح مرے ساتھ ہے رنج و الم

کتنے شوریدہ سر تھے پروانے

شام ہوتے ہی چل مرے کچھ تو

ایسا مشکل نہیں ترا ملتا

دل مگر جستجو کرے کچھ تو

ترے خیال سے نورے اکٹھی ہے تنہائی

یہ سانچہ کبھی محبت میں بارہا گذرا

دلِ فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور اٹھا

میں سوتے سوتے کسی بار چونک چونک پڑا

پھر اس کی یاد میں دل بقرار ہے، ناصر!

حالِ دل ہم بھی سناتے، لیکن

دن گزارا تھا بڑی مشکل سے

تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا

بگولے یوں اڑے پھرتے ہیں خشک جنگل میں

خدا وہ دن نہ دکھائے تجھے کہ میری طرح

تجھے یہ غم کہ مری زندگی کا کیا ہوگا!

وجہ تسکین بھی ہے خیال اس کا

زندگی جس کے دم سے ہے ناصر!

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں

حسن کی سادگی میں کیا کچھ تھا

آج تیری کمی میں کیا کچھ تھا

کہ تیرا غم غمِ لیل و نہار بھی تو نہیں

کہ راہ میں شجر سایہ دار بھی تو نہیں

دل میں یونہی سی ہے طلب کوئی

سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو

گردشِ وقت کہیں راس نہ آئی مجھ کو

شام ہوتے ہی چل مرے کچھ تو

دل مگر جستجو کرے کچھ تو

شبِ فراق ہے، یا تیری جلوہ آرائی

کہ اس نے حال بھی پوچھا، تو آنکھ کھرائی

یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کس دنوں کی یاد آئی!

تمام رات ترے پہلوؤں سے آج آئی

پچھڑ کے جس سے ہوتی شہر شہر رسوائی

جب وہ رخصت ہوا، تب یاد آیا

پھر ترا وعدہ شبِ یاد آیا

مہرِ مینے اگر اب یاد آیا

تلاشِ آبِ میں جیسے غزالی آوارہ

مری وفا پہ بھروسہ نہ کر سکے تو بھی

مجھے یہ ضد کہ مداوانہ کر سکے تو بھی

حد سے بڑھ جائے، تو گراں بگنی ہے

یاد اس کی عذابِ جاں بھی ہے

کیا سناتی ہے صبا، غور سے سن

رنگ بھی منت کشی آواز نہیں  
 خامشی حاصل موسیقی ہے  
 گل بھی ہے ایک نوا غور سے سن  
 نغمہ ہے نغمہ نما، غور سے سن  
 ہر قدم راہ طلب میں، ناصر!  
 ناصر! یہ وفا نہیں، جنوں ہے  
 تیرا ملنا تو خیر، مشکل تھا  
 اک ہمیں بار چمن ہیں، ورنہ  
 کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے  
 یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب  
 اب بھی تو پاس نہیں ہے، لیکن  
 کیوں نہ کھینچے دلوں کو ویرانہ  
 راس عہدِ نو میں قدر متاعِ وفا نہیں  
 منزل کی ٹھنڈ کوں نے لہوسرد کر دیا  
 اُس نے منزل پہ لا کے چھوڑ دیا  
 جو گھرا جڑ گئے، ان کا نہ رنج کر پیارے!  
 اس کے آنے کی کچھ کہو، یارو!  
 منہ لپیٹے پڑے رہو، ناصر!  
 ہم نے تجھ کو لاکھ پکارا، تو لیکن خاموش رہا  
 کوئی جھوٹا جو سرِ شام آیا  
 زندگی اس کے تھوڑے میں کٹی  
 نہ بچول جھڑتے ہر ہم پر، نہ برق گرتی ہے  
 اب دل میں کیا رہا ہے! تری یاد ہو، تو ہو  
 ایک تم ہی نہ مل سکے، ورنہ  
 یہ کیا کہ ایک طور سے گذرتے تمام عمر  
 پڑے ہوئے ہیں بعنوانِ سبزہ بیکار  
 یہ گھرا اسی چراغ سے آباد ہو، تو ہو  
 ملنے والے بچھڑ بچھڑ کے ملے۔  
 جی چاہتا ہے، اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ہر شے پکارتی ہے پس پردہ سکوت      لیکن کسے سناؤں، کوئی ہمنوا بھی ہو  
 عمر بھر کی نواگری کا صلہ      اے خدا کوئی ہمنوا ہی دے  
 زرد روہیں ورق خیالوں کے      اے شبِ بھرا کچھ سیاہی دے  
 آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد      آج کا دن گزر نہ جائے کہیں  
 آرزو ہے کہ تو یہاں آتے      اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں  
 ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناہرا!      ادا سی بال کھولے سو رہی ہے  
 اک نیا دور جنم لیتا ہے      ایک تہذیب فنا ہوتی ہے  
 اب جی میں ہے کہ سر کسی پتھر سے پھوٹے      نکلن ہے قلبِ سنگ سے نکلے کوئی پری  
 شور برپا ہے خانہ دل میں      کوئی دیوار سی گری ہے ابھی  
 بھری دنیا میں جی نہیں لگتا      جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی  
 وقت اچھا بھی آئیگا ناہرا!      غم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی  
 یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں      پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی  
 رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناہرا!      تم نے یہ دولت بیدار کہاں سے پائی  
 زندگی بھر وفا ہمیں سے ہوئی      سچ ہے، یارو! خطا ہمیں سے ہوئی  
 ستم ناراوا تجھی سے ہوا      تیرے حق میں دعا ہمیں سے ہوئی  
 ہاتھ زخمی ہیں، تو پلکوں سے گلِ منظر اٹھا      پھول تیرے ہیں نہ میرے، باغ کس کا ہے نہ پوچھو  
 کہیں ملا، تو کسی دن منا ہی لینگے اسے      وہ زود رنج سہی، پھر بھی یار اپنا ہے  
 مری خموش نگاہوں کو چشمِ کم سے نہ دیکھو      میں رو پڑا، تو دلوں کے طبق ہلا دوں گا  
 زباں سخن کو، سخن بانگین کو ترسیگا      سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسیگا۔  
 کہتے ہیں، غزلِ قافیہ پیمائی ہے، ناہرا!      یہ قافیہ پیمائی زرا کر کے تو دیکھو

## یوسف ظفر، محمد یوسف

یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کو کوہ مری (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ غلام رسول کامیاب تاجر تھے اور ان کا علاقہ شہر میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ گویا ظفر صاحب کو شاعری بھی ورثے میں ملی

یہ ابھی زیر تعلیم تھے کہ طویل علالت کے بعد ۱۹۲۹ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ مزید المیہ یہ ہوا کہ ظفر سے بڑی ایک ہشیر تھیں، جو والد کی وفات کے وقت پاس کھڑی تھیں؛ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں، باپ کی لاش دیکھ کر ان کے دل کی حرکت بھی بند ہو گئی۔ یوں گھر سے بیک وقت دو جنازے نکلے۔

ظفر صاحب اس وقت ساتویں درجے میں زیر تعلیم تھے۔ پندرہ برس کی عمر اور دو ایسے شدید صدمے! غریب کی دنیا تاریک ہو گئی۔ شدت جذبات نے شعر کی صورت اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنی پہلی نظم اسی موقع پر کہی، جو گویا مرثیہ تھی۔

۱۹۳۶ء میں بی اے پاس کیا اور اگلے برس ۱۹۳۷ء میں تلاش روزگار میں دلی پہنچے۔ اسی زمانے میں جوش ملیح آبادی نے پنڈت برادرز کی سرپرستی میں ماہنامہ ”کلیم“ جاری کیا تھا۔ ظفر کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ یہ بہت پریشان حال تھے۔ پوری کوشش کے باوجود انہیں کہیں کوئی کام نہیں ملا تھا۔ انہوں نے پروزگاری کے ایام میں دیواروں پر شہ پار چسپاں کرنے تک کا کام کیا تھا اور اس کی اجرت سے پیٹ بھرنے کو روٹی کھانی تھی۔ جوش نے انہیں کلیم کی منبری کی پیشکش کی۔ لیکن یہاں نمونہ کی چند ماہ بعد وہ مستعفی ہو کر لاہور واپس چلے گئے۔ یہاں انہوں نے محکمہ انہار میں کلر کی اختیار کر لی۔ اس دفتر میں پانچ



برس رہے۔ ۱۹۴۳ء میں میاں بشیر احمد (مدیر ہمایون) نے انہیں اپنے یہاں بلا لیا۔ یہ زمانہ ان کا نسبتاً اطمینان اور فن کے پہلو سے کامیاب گذرا۔ لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کا علم ہوا اور انہیں شاعر کی حیثیت سے شہرت بھی ملی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ریڈیو پاکستان میں ملازمت ملی گئی اور وہ اس میں منسلک ہو کر راولپنڈی چلے گئے۔ ۱۹۴۲ء مارچ ۱۹ء بوقت شب راولپنڈی ہی میں انتقال ہوا۔

ظفر بیچد حساس طبیعت کے انسان تھے۔ اگرچہ وہ اچھے کھاتے پیتے گھبرانے سے بے ہوش ہوئے، لیکن والد کی طویل علالت نے نہ صرف ان کا کاروبار تباہ کر دیا، بلکہ علاج معالجے نے اندوختہ بھی ختم کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد اپنی اور گنہگار کی ذمہ داری ان کے کمزور کندھوں پر آپڑی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حزن و یاس کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ شروع میں غزل کہتے تھے۔ کلیم سے تعلق کے زمانے میں جوش کے زیر اثر نظم کہنے لگے۔ لاہور گئے تو احسان دانش اور میراجی کی معیت میں یہ رنگ پختہ ہو گیا۔ آخری دو ایک سال میں پھر غزل کی طرف مائل ہو گئے تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کے جوہر غزل کی بجائے نظم میں زیادہ کھلتے ہیں۔ اس میں ان پر اختر شیرانی اور فیض کا کافی اثر تھا۔ آخری زمانے میں نعت پر بھی خصوصی توجہ رہی۔

وہ پرگو تو نہیں کہے جاسکتے، لیکن سچ زود گو ضرور تھے۔ ”زندگیاں اور زہر خند“ دو مجموعے تقسیم ملک سے پہلے شائع ہوئے تھے، اس کے بعد کے کلام کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ زہر خند سے کچھ نظموں کا انتخاب پیش خدمت ہے، ان کے کلام میں آزادہ روی اور جدتِ تعبیر کا عنصر نمایاں ہے۔

### شعرو شاعری

سوچنا یوں تو بھلا ہے، مگر ایسی کیا سوچ  
جس سے بیدار نہ ہو جو ہر ذاتی اپنا  
یہ سچ ہے غیر متفقہ و متفقہ کا خیال  
مجھ کو کیا اس سے کہ شعروں میں مرادوق نظر

ہے وہی جو مجھے ممتا زکرے دنیا میں  
 کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو  
 اسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک  
 دھیرے دھیرے مے ہمصر چلے جاتے ہیں؟  
 کیا مجھے شہرت و عزت کے لیے جینا ہے؟  
 داخلِ فرض ترنم بھی ہے شاعر کے لیے؟  
 گرد آلودہ جبین اور گریباں صد چاک  
 شاعری کے لیے کیا یہ بھی ضروری ہوگا؟  
 اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں  
 یہ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ نہیں ہو سکتا  
 میں مداری تو نہیں ہوں کہ پٹاری لے کر  
 کھیل دکھلاتا پھروں، شعبدہ بازوں کی طرح  
 میں تو خود اپنا پیمبر ہوں کہ میرے نغمے  
 میرے احساس کی تصویر بنا کرتے ہیں  
 میرے شعلے تو مری روح کی آوازیں ہیں  
 کتنی کمزور فی نظرت ہے مری سوچ کہ میں  
 اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں  
 فاعلاتن، فعلاتن سے غرض کیا مجھ کو  
 قافیہ کیا، مری تخیل کو کوئی طاقت  
 یا بحولان نہیں کر سکتی غلاموں کی طرح

۲

کون کہتا ہے کہ اشعار ہیں میرے الفاظ  
 یہ تو اک خام خیالی ہے جہاں والوں کی

میں توجہ سنتا ہوں نظروں سے تری کہتا ہوں  
یہ الگ بات ہے مفعول، فعلوں، فعلین  
یا فعلوں، فعلاتن میں بیاں ہو جاتے

## قیدی

کوئی زنجیر گراں قید نہیں کر سکتی  
سنگ و آہن کی بنائی ہوتی کوئی دیوار  
تجھ کو آغوش میں، تا دیر نہیں رکھ سکتی  
تیری فریاد ہے زنجیر گراں کی فریاد  
تیری دیوار میں پتھر کی نہیں سنگینی  
تیرے دروازے میں لوجے کی سلاخیں ہیں کہاں  
ایک آسودہ اور پام، طسمِ حبابِ مد  
تجھ کو پابند کیے دیتا ہے، تو قید نہیں  
تو ہے آزاد کہ آزادِ شب و روز ہے تو

۲

یوں تو پابند میں ہر حال میں اہل پیش  
آدمی کے لیے کیا قیدِ عناصرِ کم ہے!  
ایک ہی گردشِ ایام کے سب قیدی ہیں  
سانس بھی حلقہٴ زنجیر سے کچھ کم تو نہیں  
زندگی دیدہٴ بینا کو ہے اک جس دوام  
تو نے زنجیرِ تختیل کی سنی ہے جھنکار  
تیری زنجیر کی آواز سے کچھ کم تو نہیں  
تیری تنہائیِ شب و روز کا پیمانہ ہے  
آنکھیں سل سکتی ہیں، لب بند بھی ہو سکتے ہیں

پر تجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا  
تو ہے آزاد۔ کہ آزادِ شب و روز ہے تو

۳

سکر اچیل کی دیواروں میں رونے والے!  
تو ہے آزاد۔ زرا سوچ کہ آزاد ہے تو

تیری دیوار تو پتھر کی ہے۔ جس دیوار  
جو مرے سامنے اک سایہ بمعنی ہے

لیکن افکار کی دیوار ہے میری دیوار  
جس کو میرے ہی تخیل نے بنایا ہے ہرگز  
کوئی طاقت اسے مسمار نہیں کر سکتی

سرا ہے

راہ پر چلتے ہوئے دل میں خیال آتا ہے  
ہر قدم مجھ کو لیے جاتا ہے منزل کے قریب  
میں ابھی اپنے شبستان میں پہنچ جاؤنگا

بھول جاؤنگا کہ یہ دن بھی کٹا مر مر کے  
اور ناقوں کی ہلاکت میں بھی تلواریں  
میری ہر رگ میں لہو بن کے چلتی ہی رہیں  
بھول جاؤنگا کہ کمزور تھکی سانسوں نے  
وقت کا ایک چراغ اور بجھا ڈالا ہے  
زندگی سکوں میں ڈھلتی رہی، ڈھلتی ہی رہی

فلسفہ، شعر، محبت کے ہزاروں دفتر  
پیٹ کی آگ میں جلتے رہے، مجبور تھائیں

سینکڑوں سایے ابھرتے رہے نظروں میں میری



اور اب ایک ہی سایہ مرا، مرا ہی ہے  
ایک ہی سایہ مرے ذہن میں لرزاں ہے کہ میں  
موت سے گفتا قرین ہوتا چلا جاتا ہوں

ہر قدم مجھ کو لیے جاتا ہے منزل کے قریب  
میں ابھی اپنے بستیاں میں پہنچ جاؤنگا

### غزل (غوی اعتبار سے)

کہو! اک بات کہوں، کوئی سنیگا تو نہیں  
تم سنیوگی! ارے ہاں تم تو سنیوگی، لیکن  
سوج لو، سن کے بُرا تو نہیں مانوگی اسے  
تم بُرا مانوگی۔ میں جانتا ہوں، جانتا ہوں

خیر، لو آؤ، سنو، آؤ۔ قریب آ جاؤ  
کوئی آجا تیگا؟۔ آئیگا، تو پھر کیا ہوگا!

پھر سہی، پھر سہی، جاؤ کوئی آجا تیگا  
اب کہوں؟ سوچ لو، میں تم سے کہے دیتا ہوں

نہیں مانوگی؟ نہیں مانوگی تم؟ مان بھی جاؤ  
کیوں مجھے اپنی قسم دیتی ہو۔ ٹھہرو ٹھہرو

چھیڑتا ہوں؟ تمہیں میں چھیڑتا ہوں؟ خوب اچھا خوب!

اچھا تو آؤ، سنو۔ تم تو نہیں مانوگی  
مانوگی؟ اچھا، کہے دیتا ہوں، میں نے کل رات  
دل میں سوچا تھا کہ اب تم سے نہیں بولونگا

بھوک

بھوک زندہ رہے۔ تا حشر لو نہیں زندہ رہے

کوئی آسودہ آرام نہ ہونے پاتے

کوئی آرام سے، بیفکر نہ ہونے پاتے

اس کی عظمت رُخِ ایام پہ تابندہ رہے۔

بھوک زندہ ہی رہے، جس کی حرارت کے سبب

آنکھیں کھل جاتی ہیں، ماحول بدل جاتا ہے

دل سے تعظیم کا احساس نکل جاتا ہے

پیدا ہو جاتے ہیں سب فکرِ معیشت کے سبب

بھیڑے پھرے ہوتے پھرتے ہیں انسانوں میں

جن کی پہچان اسی بھوک سے ہو جاتی ہے

آرزو و خارشرافت کے چھو جاتی ہے

اور سینہ نظر آتے ہیں دامانوں میں

بھوک مٹ جائے، تو یہ تیری محبت کی نظر

دوہی دن میں خطِ بیکار نظر آنے لگے

ہم میں حائل کوئی دیوار نظر آنے لگے

میرے چہرے پہ بکھر جائے شکایت کی نظر

بھوک زندہ ہے تو احساس بھی تابندہ ہے

آرزو میری، تری چشمِ طلب، بھوک ہے، دیکھو!

بھوک ہے، سینہ سوزاں میں جو اک بھوک ہے، دیکھو!

بھوک سے میں ہی نہیں، تو کبھی تو پاپندہ ہے

## باقی صدیقی، محمد افضل

راولپنڈی (پاکستان) سے کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک مختصر سا قصبہ سہام ہے، وہیں ۲ دسمبر ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ اگرچہ یہ خاندان تشریشی تھا، لیکن باقی نے صدیقی نسبت کو ترجیح دی۔ ابھی آٹھویں میں زیر تعلیم تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اسی باعث تعلیم دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کم عمری میں تلاش روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا؛ اور کہاں کہاں کے کٹوس نہیں جھانکے! پانچ سال تک دیہاتی مدارس میں بچوں کو پڑھاتے رہے جب بالکل عاجز آگئے، تو قسمت آزمائی کو بھی پہنچے کہ شاید فلم میں کچھ کام ملے۔ تین برس یہاں رہے۔ دو ایک جگہ کام کیا، لیکن کوئی مستقل صورت نہ بن سکی۔ اتنے میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی، تو فوج میں حوالدار کلرک بھرتی ہو گئے۔ دو سال بعد جنگ ختم ہوئی، تو اب بعض اور فوجی محکموں میں ملازمت مل گئی۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں والدہ کی وفات نے یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا، وہ استعفا دے کر گھر آ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ادبی محاذ پر کوشش شروع کی۔ شروع میں چندے راولپنڈی کے ہفتہ وار ”راہ منزل“ میں ملازم رہے۔ سال بھر بعد ۱۹۵۱ء میں ریڈیو میں جگہ مل گئی۔ یہاں بھی بمشکل دو سال کام کیا تھا کہ تحیف میں الگ ہونا پڑا۔

آغاز شعر گوئی میں چندے سید عبدالحمید عدم سے اصلاح لی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ استاد کے لاابالی پن کے باعث یہ سلسلہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ کلام کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) جام جم؛ (۲) دار و سن؛ (۳) زخم بہار؛ (۴) بار سفر؛ (۵) شاخ بہنا؛ (۶) زاد سفر۔ آخری میں نعتیہ کلام ہے۔ وہ پنجابی میں بھی کہتے تھے۔ اس کا مجموعہ ”کچے گھرے“ کے

عنوان سے چھپ چکا ہے۔

۸ جنوری ۱۹۷۲ء میں راولپنڈی میں رحلت کی۔

چونکہ زندگی میں کبھی آسودگی نصیب نہیں ہوئی اس لیے ان کے کلام میں درد و سوز کی فراوانی ہے۔ اس پر تیکھے پن اور طنز نے اسے اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

شہرابِ ناب پستی مری رواں تھی کبھی	کچھ اس طرح تری رقت سنینہ راں تھی کبھی
ترے شگفتہ شگفتہ نقوشِ پا کے طفیل	مری نگاہ میں ہر راہ کہکشاں تھی کبھی
چمن چمن مری وحشت کا آشیانہ تھا	کلی کلی مری خوشبو سے گلستاں تھی کبھی
مری نگاہ سے تیرا غرور روشن تھا	تری نگاہ سے دنیا مری جواں تھی کبھی
جہانِ کفر و محبت میں میری بیتابی	قصا کا ناز تھا، اور زندگی کی جاں تھی کبھی
غم جہاں جو محیطِ حیات ہے، تو کیا	مری حیات محیطِ غم جہاں تھی کبھی
تجھے گلا ہے مری جانِ ناتواں سے مگر	ترا سہارا ہے جانِ ناتواں تھی کبھی

کبھی کبھی مجھے، باقی! خیال آتا ہے

وہاں نہیں ہے مری زندگی جہاں تھی کبھی

نہ اترا ڈھیلے کی دوستی پر	اسی باغ میں تھا مرا آشیانہ
یہی جہاں تھا یہی گردشِ جہاں تھی کبھی	وہ مہرباں تھے، تو چیز مہرباں تھی کبھی
زندگانی کا سب مزہ، باقی!	منحصر ہے فریب کھانے پر
کہ رہی ہیں حضور کی باتیں	ختم ہونے پہ ہیں ملاقاتیں
کس کی راتیں، کہاں کی برساتیں	آپ کے ساتھ تھیں وہ سب باتیں
کچھ اس انداز سے اس فتنہ پرور کا پیام آیا	نہ دنیا میرے کام آئی، نہ میں دنیا کے کام آیا
آپ کی، یا جہاں کی بات کریں	کون سے مہربان کی بات کریں!
ہو چکیں اُس جہان کی باتیں	اب کوئی اس جہاں کی بات کریں
ہونے کو ان سے سینکڑوں باتیں ہوتیں مگر	جس بات کا گلا تھا، وہی بات رہ گئی



## شمیم خیر آبادی، سید امیر احمد

متاخرین میں سید محمد عسکری ترمذی و شمیم خیر آبادی کا نام ایسا غیر معروف نہیں کہ کسی تعارف کا محتاج ہو۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید حسین اصغر خلفِ امام چہارم زین العابدین سجاد سے ملتا ہے۔ سید حسین اصغر کے خاندان کے ایک صاحب سید علی مدینہ سے ہجرت کر کے ترمذ (اوزبکستان) میں جا بسے تھے۔ ایک روایت ہے کہ ان کی اولاد میں سید احمد زاہد کانکاح امیر ناصر الدین بکتگیں کی صاحبزادی شاہزادی گوہر تاج (یعنی سلطان محمود غزنوی کی علاقہ نشین سے ہوا تھا۔ امیر بکتگیں کی وفات (۶۹۹۶) کے بعد سید احمد زاہد اپنے خاندان اور اعزہ و اقارب کے ساتھ ہندستان چلے آئے اور پنجاب میں مقیم ہو گئے۔ یہاں امتیاز کے لیے خاندان کا نام سادات ترمذ مشہور ہو گیا۔ مدتوں بعد سید احمد زاہد کے ورثا میں سید مہر علی شاہ قلندر پنجاب سے نکلے اور خیر آباد (ضلع سیٹاپور، یوپی) میں بس گئے۔ انہیں کی اولاد میں وسمیم کے والد سید محمد ہدی تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے: بکتگیں تخلص تھا۔

وسمیم ۱۸۵۷ء کی مشہور شورش سے پہلے پیدا ہوئے؛ ٹھیک سال معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ اس ہنگامے کے وقت میں سن شعور کو پہنچ چکا تھا۔ وسمیم نے شعر گوئی ورثے میں پائی تھی۔ انہوں نے کلام پر اصلاح امیر مینائی (ف اکتوبر ۱۹۰۰) سے لی۔ وہ مدتوں استاد کے ساتھ رامپور میں رہے۔ امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں وہ امیر کے دستِ راست تھے۔ استاد کو ان کی زبان دانی اور فنی مہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اکثر اپنے مبتدی شاگردوں کو ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ امیر اللغات کے علاوہ نور اللغات کی ترتیب میں بھی ان کا حصہ کچھ کم و قیغ نہیں تھا۔

وسیم تعلیم کی تکمیل کے بعد اولاً انگریزی حکومت کی ملازمت میں داخل ہوئے لیکن جلد ہی اس سے مستعفی ہو کر توکل علی اللہ خانہ نشین ہو گئے۔ جب ۱۸۹۰ء میں جونپور کے رئیس راجہ ہری ہر دت سنگھ ڈوبے رنگین ان کے شاگرد ہوئے، تو انہوں نے اصرار کر کے اپنے پاس بلالیا اور اپنی زندگی بھر کہیں اور جانے نہیں دیا۔ جونپور کے دوران قیام میں انہوں نے یہاں سے ۱۸۹۲ء میں گلدرستہ "گلچین" جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ بعد کو خیر آباد اور لکھنؤ سے شائع ہوتا رہا، پھر بند ہو گیا۔ ایک زمانہ بعد انہوں نے ۱۹۱۰ء سے جنوری ۱۹۱۰ء میں سیناپور سے شائع کرنا شروع کیا، اور اب اس میں نظم کے ساتھ نثری مضامین کا بھی اضافہ کر دیا۔

جب ۱۸۸۱ء میں مولوی سبحان اللہ خان رئیس گورکھپور کے بلائے ہوئے ریاض خیر آبادی گورکھپور گئے، تو موصوف کے ایسا پر ریاض نے وسیم کو بھی وہاں بلالیا۔ وسیم رشتے میں ریاض کے بہنوئی ہوتے تھے۔ وسیم یہاں مولوی سبحان اللہ خان کے کتابخانے کے نگران ہو گئے۔ یہ قیمتی کتابخانہ مولوی سبحان اللہ خان کی وفات کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دے دیا گیا تھا اور آج کل آزاد لائبریری کا ایک حصہ ہے۔ اسی زمانے میں وسیم کے ایک اور شاگرد نے "تحفہ خوشترے" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، وسیم اس کی ترتیب میں بھی شریک رہے۔

بالآخر ۱۹۲۰ء میں خاک خیر آباد کی کشش نے وسیم کو وطن بلالیا۔ یہ سفر آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کئی ہینے کی علالت کے بعد، مارچ ۱۹۲۹ء (۲۴ رمضان ۱۳۴۷ھ) کو رگڑے عالم جاودانی ہوئے۔ اپنی قیامگاہ محلہ شیخ سرائے کے متصل کی مسجد عسکری میاں کے صحن میں سپرد خاک ہوئے۔ یہ مسجد بھی خود انہیں کے نام سے مشہور ہے، اگرچہ اسے ان کے جد امجد نے تعمیر کرایا تھا۔

سید امیر احمد نسیم انہیں وسیم کے خلف اکبر تھے، یہ جنوری ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان سے بڑی ایک بہن وارثہ فاطمہ تھیں اور چھوٹے ایک بھائی سید خلیل احمد۔ یہ دونوں بھی شعر کہتے تھے۔ وارثہ فاطمہ کا تخلص صنوبر تھا اور خلیل احمد کا نسیم۔ انیسویں کہ شبیم

نے عنفوانِ شباب میں ۳ نومبر ۱۹۵۲ء (۱۴ صفر ۱۳۷۲ھ) کو انتقال کیا۔ انہوں نے اپنے نوجوانانِ کبریٰ: اس لحید میں بیسے شمیم بہشت (۱۳۷۲) اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں جو خوابِ ابدی ہیں۔ وارثِ فاطمہ کاسندلیہ میں عقد ہوا تھا۔ وہیں ۱۹ اگست ۱۹۵۴ء کو لاؤلفوت ہوئیں۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی جب استعدادِ قابلِ لحاظ ہو گئی تو مدرسہ نیازیہ خیرآباد میں بھیج دیے گئے۔ یہاں فقہ ان کا دل پسند موضوع تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد منبع الطب کالج لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ دو سال تک یہاں تحصیل کی تھی کلیک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے وقتی طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شاید وہ طب کی تکمیل نہ کر سکیں۔ ہوا یہ کہ ان کے والدِ وسیم صاحب کسی کام سے راجہ صاحب محمود آباد کی ملاقات کو لکھنؤ آئے، تو بیٹے کے دیکھنے کو منبع الطب کالج پہنچے۔ دورانِ گفتگو میں کسی مناسبت سے انہوں نے بیٹے سے کسی شعر کے معنی پوچھے۔ قسمت سے یہ تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ اس پر وسیم بگڑ گئے، بہت برہم ہوئے، فرمایا کہ یہاں تم ترقی معکوس کر رہے ہو۔ یہ کہا اور انہیں کالج سے اٹھا کے اپنے ساتھ واپس خیرآباد لے گئے۔ چندے بعد لوگوں کے پجھاؤ سے انہوں نے انہیں کو معاف کر دیا، اور یہ واپس لکھنؤ چلے گئے۔ انہوں نے ۱۹۲۷ء میں طب کی تعلیم مکمل کی اور درجہ اول میں پاس ہوئے۔ پھر اگرچہ انہوں نے خیرآباد میں یونانی دواخانہ کے نام سے اپنا مطب قائم کیا، لیکن خود نسخہ بہت کم لکھتے تھے؛ زیادہ تر مشہور مقامی حکیم انوار حسین صاحب کے نسخے ان کے پاس آتے تھے، جس سے اچھا خاصا کام چلتا رہا۔ بعد کو یہ مطب بھی بند ہو گیا۔

جب وسیم، مولوی سبحان اللہ خان کے بلاوے پر گورکھ پور گئے، تو انہیں بھی والد کے ساتھ تھے۔ اس زمانے میں یہاں ریاض اور وسیم کے قیام کے باعث گورکھ پور گویا شعر و سخن کا مرکز بن گیا تھا۔ انہیں بھی وہاں کسی مقامی کالج (یا اسکول) میں اردو اور فارسی کے مدرس ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں وہ ”گلچین“ اور ”تحفہ خوشتر“ کے معاون مدیر بھی رہے جب زمانے نے گورکھ پور کی بساط الٹی، تو انہیں اولاً صوبہ بہار گئے۔ جب وہاں قدم

تہم کے توجید۔ آباد (دکن) کی راہ لی۔ ایک زمانہ بعد ۱۹۴۹ء میں واپسی ہوئی۔ ۱۹۵۰ء۔  
 ۱۹۵۱ء کا ایک سال وہ مدرسہ نیازیہ، خیرآباد میں فارسی کے مدرس رہے۔ پھر جولائی  
 ۱۹۵۵ء سے فروری ۱۹۶۰ء تک مدرسہ اشاعت العلوم، خیرآباد میں بھی شغل رہا۔ خیرآباد  
 سے اس زمانے میں جمال الدین اسیر انصاری کی ادارت میں ایک رسالہ "کاروان" شائع ہوتا  
 تھا۔ انیم بھی اس کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ جب "کاروان" نے دم توڑ دیا، تو یہ  
 کانپور پہنچے اور وہاں مدرسہ ارشادیہ میں مدرسہ کی کرلی۔ دو سال بعد ۱۹۶۲ء میں وہیں  
 کے ایک اور مدرسے احسن المدارس میں منتقل ہو گئے۔ کانپور سے ایک رسالہ "جھلک"  
 نکلتا تھا۔ مدرسے کے ساتھ اس کی ایڈٹری کے فرائض بھی سرانجام کرتے رہے۔ مدتوں  
 اس رسالے کی پیشانی پر انیم کا یہ شعر چھپتا رہا تھا۔

جھلک دکھا کے محبت سکھاتی جاتی ہے

یہ آگ خود نہیں لگتی، لگائی جاتی ہے

آخری زمانے میں قیام بیشتر کانپور ہی میں رہا، اگرچہ خیرآباد کی ادبی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی  
 لیتے رہتے تھے۔ مثلاً ۱۹۵۷ء میں خیرآباد میں ایک انجمن ادب قائم ہوئی، تو وہ اس  
 کے صدر بنائے گئے تھے۔ یہ انجمن زیادہ دن نہ چل سکی اور سال بھر بعد ختم ہو گئی۔

۱۳۹۰ھ میں رمضان کی چھٹیاں گزارنے کو وطن آئے۔ یہاں اجباب اور بچوں کے اصرار  
 پر کانپور کی واپسی متوی کر دی۔ اتنے میں بیمار ہو گئے۔ خدا خدا کر کے مہینوں بعد بخار نے  
 پیچھا چھوڑا، تو اب اسہال کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ عمر اور اس پر ایسے موزی مرض کا حملہ؛  
 کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ چند دن میں سوکھ کر کاٹھا ہو گئے۔ علاج معالجے کے باوجود  
 حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اسی میں ۶ اپریل ۱۹۷۲ء قبل دوپہر سو اگیارہ بجے کے  
 قریب جان بحق ہو گئے۔ آخری الفاظ تھے: اول اللہ، آخر اللہ۔ نمازِ جنازہ درگاہِ مخدوم  
 شیخ سعدی میں ان کے دوست سید نجم الحسن رضوی نے پڑھائی اور بعد مغرب انہیں  
 اپنے والدِ دسیم کے قریب مسجدِ عسکری میاں کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔ مولوی  
 نثار احمد فاروقی عارف خیرآبادی کے قطعہ تاسخِ وفات کا آخری شعر ہے۔



بروجِ مرقدِ عارف! این سالِ وفاتش کن رقم  
"روحِ ادب، کانِ صفا، سید امیر احمد انیم"

اولادِ جسمانی میں دولڑکے (یقین احمد عرف انس میاں اور شیر احمد) ان سے یادگار  
ہیں۔

انہوں نے کلام پر اصلاح اپنے والدِ وسیم مرحوم سے لی تھی، اور خود درجہ استادِ حاصل  
کیا۔ اس دور کے اکثر رسائل و جرائد میں ان کا کلام ملتا ہے۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی بہت  
لکھا اور اس میں بھی کسی سے پیٹے نہیں تھے۔ خوشنویس بھی اچھے تھے۔ تلامذہ کی بڑی تعداد  
نے ان سے استفادہ کیا۔ افسوس کہ مجموعہ کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ تمام اصنافِ سخن میں وافر  
کلام ان کے اعزہ کے پاس موجود ہے۔ جناب وصی سیتا پوری نے قدسی خیر آبادی  
صاحب کامرتبہ کچھ کلام مہیا کیا ہے، اسی سے مندرجہ ذیل انتخاب پیش کر رہا ہوں:

رہے زندگی بھر محبت کے بندے	نہ ہم دین سمجھے، نہ ایمان جانا
محبت ذریعہ ہے قربِ خدا کا	انیم! اس کو ہی ہم نے ایمان جانا
آپ ہی ہم ہیں مدعا اپنا	نہیں ملتا، ہمیں پتا اپنا
مدد اپنی اگر ہمیں نہ کریں	کام نکلے کسی سے کیا اپنا
تجربے یہ بتاتے ہیں کہ، انیم!	آسرا ہے تو آسرا اپنا
ہاں بہا ر آئی، آ کے جا بھی چکی	بیدلوں کے دلوں کا کھلنا کیا
جان اگر جاتی ہے تو جا غے، انیم!	جونہ ملتا ہو اس سے ملنا کیا
ہر پھر کے خود گرفتہ کوئی پھر کہیں گیا	سو بار کھچا چکا تھا قسم، پیر وہیں گیا
اٹھا تو دل پکڑ کے، گیا دل کو چھوڑ کے	مخمل سے جو گیا تری، اندوہ گین گیا
گو ہو چکی ہے یاد فراموش آپ کی	لیکن جو اصرار اب تھا دل کا، نہیں گیا
ایک میں ہوں کہ وفا پر سبھی ندامت ہے مجھے	ایک وہ ہے کہ جفا کر کے پشیمان نہ ہوا
کام جتنا عقل نے عقدہ کشائی سے لیا	اور کبھی سر بسٹہ ہر راز نہاں بنتا گیا

جو ہر دانش رہا صرف عرض انکشاف  
 زمین انساں بندہ وہم و گماں بنتا گیا  
 دینے والے کا کیا کریں شکوہ  
 ہم کو حسن طلب نہیں آتا  
 تازہ ہے شعلہ سرکش کو بھی رعنائی کا  
 ابھی دیکھا نہیں عالم تری انگڑائی کا  
 میری محفل یہی نیرنگ تصور میرا  
 میری دنیا، یہی گوشہ میری تنہائی کا  
 اشکِ غم کی ہم سمجھتے ہی نہ تھے کوئی بساط  
 یہ وہ قطرہ تھا، بڑھا اور بڑھ کے دریا ہو گیا  
 جو نہ دنیا میں کسی کا ہو، کہیں کا وہ نہیں  
 رہتے رہتے دل میں، اب تو غم کسی کا ہے اٹیم  
 بیگانگی دل کا نہ کچھ پوچھ ماجرا  
 کونئی تو بات ہے کہ ملا جب کبھی اٹیم  
 غم سے آزاد ہی نہ تھا گویا  
 دل کہ آباد ان کی یاد سے ہے  
 عشق نے یوں مٹا دیا سب کچھ  
 دل کی ویرانگی کوئی دیکھو  
 جان وے دی، نہ اُف اٹیم نے کی  
 اس نے دل و جگر جو لیے، کیا ہوا، اٹیم!  
 بالیدگی روح کا رکھتا نہیں اثر  
 کرتے ہو اس کے مشرب و ملت کا ڈگوا  
 سینہ تمام درد سے معمور ہو گیا  
 سامانِ راحتِ دل رنجور ہو گیا  
 دل کے ہر گوشے میں ارمانوں کی اک بستی ہے  
 ایک ہی ہوتا، مگر آپ کا ارماں ہوتا  
 زباں کوئی سمجھتا ہے، نہ اندازِ بیاں اپنا  
 شناسا ہی نہیں کوئی، خداوند، یہاں اپنا  
 یقین تو ہے، مرے ہر دعوے کی تصدیق ہو جاتی  
 نہیں منظور ہے، افسوس، ان کو امتحاں اپنا

شکار آپ اپنی نادانی کے ہم ہیں اپنے ہاتھوں سے  
 نہ دشمن ہے زمین اپنی، نہ دشمن آسماں اپنا

بغیر اس کے جینا ہے بیکار جینا مگر زندگی ہے، تو ناچار جینا  
 جو دیوانگی ہو گزر جائے جوں توں مگر عشق میں اس کے ہشیار جینا  
 نہیں عشق میں چین کی کوئی صورت اک آزار مرنا، اک آزار جینا  
 اہم! ایسے جینے سے مرنا ہی اچھا کہ جینا، مگر بادل زار جینا

جب کام ہی تمام کیا اپنا درونے اب کیا بتائیں، درد کہاں تھا، کہاں نہ تھا

مجھے ان کے بھی نام ہیں یاد بہت، کبھی جن کا جہاں میں زمانہ رہا  
 وہ زمانہ فسانہ بنا تو؛ مگر نہ زمانہ رہا، نہ فسانہ رہا  
 تجھے جو روستم کا مزانہ رہا، ہمیں شکوہ جو روح فسانہ رہا  
 نہ وہ تو یہی رہا، نہ وہ ہم ہی رہے، نہ وہ جوش جنوں کا زمانہ رہا  
 نہ تو قیس رہا، نہ تو لیلیٰ رہی؛ یہاں شیریں مری، گنگی کو مکنی  
 نہ وہ شہرت حسن و جمال رہی، نہ ہی جوش جنوں کا زمانہ رہا  
 تھیں ہونہ خوشی، کوئی جو نہ مرے؛ تمہیں رنج نہ ہو، جو کوئی نہ بیچے  
 تمہیں اپنے ہی کام سے کام ہے بس تمہیں کیا کہ رہا کوئی یا نہ رہا  
 نہ وہ درد رہا، نہ وہ سوز رہا، نہ وہ ٹیس رہی، نہ تڑپ ہی رہی  
 ہے اگرچہ آگ آگ کھول میں لگی، مگر آہ کہ اب وہ مزانہ رہا  
 رن موت کو سن کے عدو نے کہا، کوئی غم تو نہیں ہے یہ غم ایسا  
 بچھے غم ہے اگر تو ہے غم اس کا، کوئی دہریں اہلِ وفا نہ رہا

زندگانی میں زرا شوق کی ہسیریں تو بھرو بن ہی جاتی گایہ افسانہ فسوں آپ سے آپ

درد کی قدر معین ہی نہیں ہو سکتی ہاں تڑپ دل کی ہے رہ رہ کے فزون آپ سے آپ

سنانے نکلا ہوں نعمتِ غم، میں دل و نگاروں کو ڈھونڈتا ہوں

رباب اٹھا کر رباب میں میں شکستہ تاروں کو ڈھونڈتا ہوں

نہ حسنِ خوباں کی آرزو ہے، نہ جلوہ زاروں کو ڈھونڈتا ہوں

نظر کے دامن میں جو چھپے ہیں، میں ان نظاروں کو ڈھونڈتا ہوں

کھلے تو کیونکر کھلے حقیقت کہ مہر بر لبِ سی ہے محبت

جو دل کے مضمون کی ہے عبارت، میں ان اشاروں کو ڈھونڈتا ہوں

جو اپنے مشرب کے لوگ ہوتے ہیں، ڈھونڈتی ہے انھیں کو دنیا

نثار کرنی ہے جان مجھ کو، میں جان نثاروں کو ڈھونڈتا ہوں

اشیم! میں جو شگفتہ خاطر، شگفتگی ہوا کھیں مبارک

دل شگفتہ لیے ہوتے ہوں، میں دلفگاروں کو ڈھونڈتا ہوں

شکوہ گردش کا آپ کو ہے، اشیم! گوشہٴ عانیت سے نکلے کیوں؟

کیا چیز یہ پُر خلوص یارانہ ہے کیا شے دو مخلصوں کا افسانہ ہے

بیگانہ وفا کرے، تو اپنا ہے، اشیم! اپنا نہ وفا کرے، تو بیگانہ ہے

بیفادہ شغل، گھونٹ غم کے پینا بیکار سی بات، زخمِ دل کے سینا

دو بھر کتنی ہی زندگانی ہو، اشیم! جب تک نہ اجل آئے، ہے از بس جینا

رکھنے کو تو رکھتے کتنے جو ہر ہیں ہم

ناچیز ہیں، خاک کے برابر ہیں ہم

سب کچھ موقوفِ حسنِ ظن پر ہے، اشیم!

مانو، تو دیوتا! نہیں، تو پتھر ہیں ہم

## علم ازہر مظفرنگری، محمد عبیدیم صدیقی

ان کی ولادت ۶ جون ۱۹۱۴ء کو ضلع مظفرنگر کے قریب ایک قریہ حسین پور، بسیرہ میں ہوئی (اصل میں لفظ بسیرہ ہوگا جو مور زمانہ سے دیہاتیوں نے بگاڑ کر بسیرا بنا دیا) ان کے والد جناب محمد عمر (ف ۱۹۵۵ء) مدرس پیشہ تھے، وہ ساری عمر مختلف مقامات پر صدر مدرس رہے۔ علم صاحب نے ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول، مظفرنگر سے بی اے کی سند حاصل کی۔ اگلے تعلیم جاری رکھنے کے وسائل مفقود تھے، اس لیے اب تلاش معاش کی فکر ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں ایک مقامی زمیندار کے ہاں کارندے مقرر ہو گئے۔ تین سال بعد ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، تو فوجیوں کی ضروریات مہیا کرنے کی خاطر حکومت نے کیمبل بانی کے کارخانے قائم کیے تھے۔ یہ کام بہت وسیع پیمانے پر ہوتا تھا۔ منڈی سے اون کی خرید سے لے کر کیمبل کے جینے تک کا سارا کام سرکاری ملازموں کے ذمے تھا۔ علم صاحب اس محکمے میں بچیس روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ اس سلسلے میں وہ مظفرنگر، نریڑا، امرہ، جالپٹھ، کیرانہ وغیرہ مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ تنخواہ میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ انسران مجازان کے کام سے مطمئن تھے، اور یہ خود بھی سکون سے تھے کہ اب ستر روپیہ ماہانہ ملتا تھا۔ لیکن اواخر ۱۹۴۱ء میں بہتر ملازمت مل جانے کی وجہ سے یہ نوکری چھوڑ کر جنرل اسٹور کا پور چلے گئے یہاں سے کٹنی تبادلہ ہوا اور وہاں سے ناگپور جانا پڑا۔ ناگپور میں تھے کہ یرقان کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر سولہ ہینے کی طویل رخصتِ علالت لینا پڑی، جس کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا۔ ۱۹۴۶ء میں تندرست ہونے کے بعد وہ واپس آئے، تاکہ یہاں



ٹروڈر جنرل کے دفتر سے دوبارہ ملازمت کا حکمنامہ حاصل کر سکیں، مگر اس میں میا بی نہ ہوتی۔ بسراوقات کے لیے دلی کے قیام کے زمانے میں یہاں کے مختلف رسائل میں روزانہ تھوڑا تھوڑا وقت کام کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۴۸ء میں مستقل طور پر ماہنامہ شمع کے دفاتر میں ملازم ہو گئے۔ اس ادارے کے دونوں بچوں (شمع اور شبستان) کی تقسیم و اشاعت اور دفتر سے متعلق قانونی کام کاج انہیں کے ذمے تھے۔

پہلی مرتبہ ۱۹۴۱ء میں ان پر دل کا دورہ پڑا۔ اسپتال میں چند ہفتے رہ کر گھر آ گئے، لیکن لگے لگے یونہی ڈاکٹروں نے ڈرایا اور ملہکان کیا، صرف فشارِ دم کا عارضہ ہے لیکن محض نفس کا دھوکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے احتیاط سے ہو گئے۔ دوسرا حملہ بھی اچانک ہوا اور یہی جان لیوا ثابت ہوا۔

جمعے کے دن ۲۱ اپریل ۱۹۴۲ء صبح کے وقت حسبِ معمول دفتر آ گئے۔ یکایک سیٹے میں درد کی شکایت کی۔ ہمدرد نرسنگ ہوم، شمع کے دفتر کے پڑوس میں ہے؛ وہاں پہنچا یا گیا بیوی بچے بھی پہنچ گئے۔ ان سے بات چیت کرنے لگے۔ معاملے کی نزاکت کا کسی نے حساس نہ کیا۔ باتیں کرتے دوپہر کے قریب رُوحِ نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

تالٹھ وانا الیہ راجعون۔ اسی شام درگاہِ باقی باللہ رحیم ندین عمل میں آئی۔ اولاد میں چار لڑکے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے عظیم اختر حکومتِ ہند کے محکمہ اطلاعات میں ملازم ہیں، چھوٹے تینوں ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔

عر میں انھیں تلمذالم مظفرنگری (اف سئی ۱۹۶۹) سے تھا، اگرچہ زیادہ تر استفادہ سیما ب اکبر آبادی مرحوم سے کیا۔ کلام کا مجموعہ ”نکبتِ گل“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (دلی ۱۹۵۷ء)۔ اس پر یوپی حکومت نے انعام بھی دیا تھا۔ ایک مختصر سا مجموعہ قطعاً (صویر) بچوں کے لیے ”پھول پتے“ کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں خود شائع کیا تھا، جس میں سہل اور سادہ زبان میں سبق آموز قطعاً شامل ہیں۔ ایک مجموعہ نعتِ نوارِ حرم، بچوں کے لیے دوسرا مجموعہ ”نظم گل بوٹے“ اور ”بوے گل“ (دیوانِ غزلیات)

مرتب شدہ غیر مطبوعہ چھوڑے۔

میں انہیں پچھلے ۲۰-۲۲ برس سے جانتا تھا۔ بڑے مخلص اور بے ریا دوست تھے۔ حال آں کہ بچہ مذہبی آدمی، اور صوم و صلوة بلکہ اوراد و وظائف تک کے پابند اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (ف ۱۹۵۷ء) سے بیعت تھے لیکن طبیعت میں عبوست نہیں تھی؛ اس کے برعکس ان کی گفتگو میں شگفتگی اور بذلہ سنجی کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ میں نے انہیں کبھی بیماری کی حالت میں بھی نگلیں اور گرفتہ خاطر نہیں دیکھا۔ دعا ہے کہ اسی طرح خوشی خوشی وہ اپنے خالق کے حضور میں بھی حاضر ہوئے ہوں۔ آمین!

اعجاز صدیقی نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ وفات میں گویا ان کی پوری سیرت بیان کر دی ہے:

اکیس اپریل، جمعہ ظہر کا وقت	طے بہ عجلت کیا عدم کا سفر
کر گئی آکے خود اذانِ مرگ	بے نیاز رکوع و سجدہ و سر
صرف پنجاہ و ہشت سال تھی عمر	زندگی اس کی تھی مثالِ شرر
درِ دل نے کچھ ایسی کروٹ لی	کر سکے کچھ نہ اس کے چارہ گر
شاعرِ نغزگو، ادیبِ شہیر	عابدِ خوش مذاق و نیک سیر
خوب ہنستا رہا، ہنسناتا رہا	اپنے غم کی نہ دی کسی کو خبر

دل کے ہاتھوں ہی لٹ گیا، اعجاز!

شاعرِ دل زدہ **علیم اختر**  
(۱۹۷۲ء)

علیم اختر مرحوم کے مجھ سے بہت یگانگت کے تعلقات تھے۔ انہوں نے میرے نام کا سجع بھی کہا تھا!

از بس کہ میرا نام بھی اللہ کا اک نام ہے

کیوں فکر ہو، اختر! مجھے جب میرا مالک رام ہے

انہوں نے اپنی وفات سے چند دہائیوں قبل اپنے دوسرے (غیر مطبوعہ) دیوان "بوسے گل" کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ بطور ہدیہ مجھے دیا تھا۔ مندرجہ ذیل انتخاب اسی

دیوان سے ہے۔ ان کا پہلا دیوان ”نکبت گل“ شائع ہو چکا ہے، اور بازار میں دستیاب ہے۔

آپ سے دوستی کیے نہ بنی	ہم سے یہ دشمنی کیے نہ بنی
افتد اللہ یہ تجھ دید رہ در رسم ستم	مائل لطف و کرم بارِ دگر ہے کوئی
عشق اس وادی حیرت سے گذر جاتا ہے	کوئی منزل نہ جہاں رہ گزر ہے کوئی
رہتا ہے اداس اداس، پھر دل	کیا پھر کوئی بات ہو گئی ہے
اے مرگِ محبت! آج تجھ سے	تکمیلِ حیات ہو گئی ہے
غم سے بھی بے نیاز، خوشی سے بھی بے نیاز	کیا کشتگانِ غم کا بنایا گیا ہے دل
تیری جفا نے حوصلہ غم بڑھا دیا	ظلم و ستم سے دادِ وفا پا گیا ہے دل
اے فرطِ اضطرابِ محبت! خبر نہیں	دل بیقرار ہے کہ نظر بقیہ راز ہے
ہاے غم کی منزلِ دشوار	عشق کو بھی شکستہ پا دیکھا
اور بھی دور ہو گئی منزل	ہم نے جب کوئی آسرا دیکھا
اب بار بار ان کی ندامت کا ہے خیال	اٹھنے کو اٹھ تو آئے ہیں اس آنجن سے ہم
اب ان سے کوئی رسمِ ملاقات نہیں ہے	اور بات ہے اتنی کہ کوئی بات نہیں ہے
اب خود نگہِ ناز ہے بیتابِ گزارش	کیا جانے، کیا بات ہے، کیا بات نہیں ہے
کسی کا وعدہ فردا، وفا تو کیا ہوگا	یہ فکر ہے کہ وفا ہو گیا، تو کیا ہوگا!
بلند بانگِ ارادوں کے باوجود، انسان	خود آدمی بھی نہیں بن سکا، تو کیا ہوگا!
وہ اک خلش ہے کہ جسے آرزوے شوق کہیں	جو بن گئی وہی خود مدعا، تو کیا ہوگا!
فسانہ غم ہستی سنا تو دونوں، لیکن	جبینِ ناز پہ بل آگیا، تو کیا ہوگا!
وہ پشیمان نگاہی، دو جمالِ رعنا!	ایک رنگ آئے ہے، اک رنگ آ رہا ہے
اے زہے کاہشِ غم، تابشِ رعنائیِ شوق!	زندگی ہے کہ بہ طور، سنور جائے ہے
غم حیات، غم جاوداں نہیں ہوتا	غم حیات مگر زندگی پہ بھاری ہے
ہزار عیش و مسرت کے باوجود، اخترا	وہ کون ہے کہ جسے غم سے دستکاری ہے

وہ فرطِ کیفِ بادہ، وہ انفاسِ عطرِ سبز  
 وہ نکہتِ تمام، وہ بوئے سمن کی بات  
 اک بزمِ سوگوار، مری شامِ انتظار  
 اک عشرتِ تمام، تری انجن کی بات

---

خوشا کہ شام سے پیدا ہیں صبح کے آثار  
 اک بھر رہی ہے سنہری کرن، سبولا  
 اور کے گلستاں سے کیا مطلب!  
 کیوں نہ اپنے چمن کی بات کریں

---

فرصتِ فکر و فن کسے، اخترا!  
 اب کہاں فکر و فن کی بات کریں!  
 کھلے ہیں حسرت و ارمان و آرزو کے کنول  
 کئی کئی چسبن دل کی سکرانی ہے

---

مسترتوں نے تو بیخوابِ آرزو رکھا  
 دلوں کو سایہٴ غم ہی میں نیند آئی ہے  
 وہ ارماں جو نہ نکلے دشمنی سے  
 نکالنے جا رہے ہیں دوستی سے

---

مبارک، ترکِ رسم و راہِ الفت  
 نگر یہ آنکھ میں آنسو ابھی سے!  
 علیمِ اختر! یہ آخر بات کیا ہے؟  
 نہ کچھ کہنا، نہ کچھ سننا کسی سے!

---

دل میں کیوں اک ہوک اٹھی ہے  
 کیا پھر کوئی بات ہوئی ہے!  
 دل کی بازی، اللہ اللہ!  
 جیت بھی اکثر ہار ہوئی ہے

---

تنگہ شوق کو رہ رہ کے گماں ہوتا ہے  
 ان سے پہلے بھی ملاقات ہوئی ہو جیسے  
 پھر وہ کیفیتِ دل، ترکِ ملاقات کے بعد  
 ہاے، ہر شے میں کسی شے کی کمی ہو جیسے

---

ویسے تو نہ آنے کے بہانے ہیں ہزاروں  
 ہاں، یاد نہ آنے کی بھی تدبیر تو دیکھو  
 وہ عرضِ غمِ شوق پہ خسا موشی پیہم  
 آہنگِ دل آویزی تصویر تو دیکھو

---

اس طرح چپ ہوں کوئی بات ہوئی ہو جیسے  
 کسی جنگل میں کہیں رات ہوئی ہو جیسے  
 ہاے، یہ عیش و مسرت، یہ خوشی کا عالم  
 غمِ دوراں سے ملاقات ہوئی ہو جیسے

---

مل کے اب ان سے، یہ محسوس ہوا ہے اخترا!  
 مفلسی میں بس اوقات ہوئی ہو جیسے  
 کس کے غم میں خراب ہو؟ اخترا!  
 کون ہے وہ، کسی کا نام تو لو!

---

وہ اک نظر کہ جسے التفاتِ ناز کہیں  
 اس اک نظر نے فسانے بنائے ہیں کیا کہ  
 ستم و جورِ گاہ گاہ نہیں  
 ان سے اب کوئی رسم و راہ نہیں

---

یا انھیں رخصتِ جمال نہ تھی  
 یا ہمیں فرصتِ نگاہ نہیں



کون لیتا ہے خبر سوختہ سامانوں کی!  
 اٹھ کے محفل سے تری جانے کہاں پہنچے ہیں  
 شوق کس منزل پر کیف پہ لے آیا ہے  
 بات بڑھ کر تری مستی نظر تک پہنچی

کسے معلوم کہاں خاک ہے پروالوں کی!  
 اب تو آواز بھی آتی نہیں دیوانوں کی  
 شوق اپنا ہے نہ کچھ فکر ہے بیگانوں کی  
 گفتگو چھپر گئی رندوں میں جو میخانوں کی

شب غم میں بھی دلکشی سی ہے  
 زندگی میں کوئی کمی سی ہے  
 آدمیت ہے مگر لاشہ بے گور و کفن  
 کام آہی گیا شوق کا دیوانہ پن

صل ہی شاد کام شوق نہیں  
 وہ نہ جب تک ملے رہا احساس  
 جسم آدم پہ ہے زرتار لباسِ اخلص  
 اب مرے نقش کف پاہیں نشانِ منزل

آدمیت ہے مگر لاشہ بے گور و کفن  
 کام آہی گیا شوق کا دیوانہ پن  
 ان دنوں میری وفا کو ہے تلاشِ دشمن  
 کبھی نمناک نگاہی، کبھی ابرو پہ شکن

کیا تماشائے نظر ہیں یہ ترے دیوانے  
 رہو راہِ محبت ارگزارِ عشق میں  
 جلوں سے ترے انجمن دل ہے منور  
 کیا ہے جو ترے لطف پہ نازاں ہے کوئی آج

جو ٹھہر جائے ہے اگر دکارواں ہو جائے ہے  
 آنکھوں کو مگر دید کے ارمان رہے ہیں  
 ہم بھی کبھی شرمندہ احسان رہے ہیں  
 کیا یقین سنگِ سرِ منزل اور ہام بھی ہے

ننگہ شوق کی بیگانہ روی کے صدے  
 کیا تماشائے نظر ہیں یہ ترے دیوانے  
 رہو راہِ محبت ارگزارِ عشق میں  
 جلوں سے ترے انجمن دل ہے منور

کیا ہے جو ترے لطف پہ نازاں ہے کوئی آج  
 جب گماں حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یقین  
 ننگہ لطف کا پردہ ہے تغافلِ اختر!  
 شاید اک دوسری تقدیر نمایاں ہو جائے

نارسانی میں ہے اک جہدِ مسلسل کا پیام  
 کوئی ہمدم ہے نہ دمساز، نہ کوئی آواز  
 اختر! اس میں تو کہیں ذکر نہیں ہے ان کا  
 تعجب ہے کہ مجھ سے پوچھتے ہو

کونئی آہٹ بھی نہیں ہے کوئی دستک بھی نہیں  
 کچھ تو ہے ہم جو تری بزم میں آتے ہی نہیں  
 فاصلوں کا بھی تعین نہیں ہونے پاتا  
 شوقِ بیناب مگر جانبِ در دیکھے ہے

کبھی آتے ہیں تو آجاتے ہیں آتے جاتے  
 راستے کتنے بدل جاتے ہیں آنے جاتے  
 شوقِ بیناب مگر جانبِ در دیکھے ہے  
 کبھی آتے ہیں تو آجاتے ہیں آتے جاتے



ایسے لگتا ہے کہ یہ خط مرے نام آیا ہے  
وہی وعدہ، دل پر شوق کے کام آیا ہے  
اب کہیں جل کے ترا وعدہ شام آیا ہے

خود فریبی کا بُرا ہو کہ خود اپنی تحریر  
وہ ترا وعدہ فردا کہ جو ایفانہ ہوا  
دن تو موموم امیدوں کے سہارے گزرا

## جلال آزادی

(۱)

ہر اک نگاہ کو تھی جستجو سے آزادی  
ہر اک زبان پہ تھی گفتگو سے آزادی  
دلِ عوام میں برسوں رہی کسک بن کر  
بقدر شوق و وفا آرزو سے آزادی

(۲)

فضا میں گونج اٹھا: "انقلاب زندہ باد"  
یہ کس نے چھیڑ دیا ہے ربابِ آزادی  
جھلک رہی ہے شہیدوں کے خون کی سرخی  
ہلک رہا ہے چمن میں گلابِ آزادی

(۳)

جلالِ بادِ شہی، سطوتِ جہا نبائی  
مری نگاہ تھی آئینہ دارِ آزادی  
نشانِ جادہ منزل تھا میرا نقشِ قدم  
چلی تھی ساتھ میں خود رہ گزارِ آزادی

(۴)

یہ سوچتا ہوں مرا عزمِ شوق ہی تو نہیں  
یہ ایک راہِ برتسینز گامِ آزادی  
مرے خلوصِ وفا کی حکایتیں ہی نہ ہوں  
یہ ایک نامہ رنگیں بنامِ آزادی

(۵)

اگست کی یہ پندرھویں کہ جس میں پنہاں ہے  
عروجِ نقطہ صد ماہ و سالِ آزادی  
جھٹک کے دامن رنگیں سے گردِ محکومی  
یہ ہوئے ہے جلوسِ جلالِ آزادی

## ظفر، سراج الدین ظفر

ظفر دراصل ان کا تخلص نہیں تھا، بلکہ جزوِ علم تھا؛ ماں باپ نے یہ نام خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدین ظفر کے نام پر رکھا تھا۔ اسی لیے جب بعد کو انھوں نے شعر کہنا شروع کیا، تو تخلص کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو جہلم (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان لگھڑ کہلاتا ہے۔ ان کے دادا لگھڑوں کی شاخ اسکندر آل کے شیخ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لگھڑ قوم ایرانی الاصل ہے۔ والدِ اعظم۔ ان کے والد محمد عبدالقادر صاحب ریل کے محکمے میں انجینئر تھے۔ ان کی والدہ مسز (زینب) عبدالقادر دراد و حلقوں میں افسانہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے ناول راہبہ، صدا سے جس، وادی قاف، لاشوں کا شہر، وغیرہ خاصے مشہور ہیں۔ اور زمانے کا مذاق بدل جانے کے باوجود آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔ مسز عبدالقادر کو تصنیف کا شوق اپنے والد مولوی فقیر محمد (یعنی ظفر کے نانا) سے ملا۔ مولوی صاحب موصوف دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی دینیات سے متعلق متعدد مصنفات موجود ہیں: "حدائق الحنفیہ" ان کی مشہور تصنیف ہے۔ کوئی پچاس برس تک وہ ایک پرچہ "سراج الاخبار" بھی نکالتے رہے تھے۔

ظفر نے ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے دو سال بعد وکالت کی سند (ایل ایل بی) لاکالج، لاہور سے حاصل کی (۱۹۳۵ء) انھوں نے اولاد وکالت ہی کا پیشہ لسراوقات کے لیے اختیار کیا، لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے اسے ترک کر کے دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں فوج کے ہوائی

شعبے میں ملازمت کر لی۔ اس زمانے میں انھوں نے برما کے محاذ پر جاپان کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ وہ اس محکمہ میں دس برس رہے، لیکن یہ ملازمت بھی بھاری پتھر ثابت ہوئی۔ جنگ کے خاتمے پر وہ اس سے الگ ہو گئے؛ اس وقت گروپ کپتان کے عہدے پر فائز تھے۔ اب سب طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے ۱۹۵۰ء میں تجارت کی طرف رخ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا لاہور اور کراچی کے مشہور ناشر کتب مولوی فیروز دین (صاحب فیروز سنز) کی صاحبزادی (بشیرہ) سے نکاح ہوا تھا۔ مولوی صاحب موصوف نے ان کی ڈانواں ڈول حالت دیکھ کر انھیں اپنے ادارے میں جگہ دے دی۔ اس کے بعد ان کی معاشی تنگ و دوآزر پریشانی کا دور گویا ختم ہو گیا، اور اب وہ خاصی کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئے۔

انھیں آخری چار پانچ برس دردِ شقیقہ کی شکایت رہی۔ جب اس کا دورہ پڑتا تھا، تو اتنا شدید کہ وہ بالکل ازکار رفتہ ہو جاتے تھے۔ علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی، لیکن بیسود؛ نہ صرف اس سے کوئی افادہ ہوتا، بلکہ روز بروز حالت بگڑتی ہی گئی۔ دماغ کی تمام رگیں متورم ہو گئی تھیں اور اس کا اثر دل تک پہنچ گیا تھا۔

جس علمی اور ادبی ماحول میں وہ پیدا ہوئے تھے، اس میں ان کا تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہونا قدرتی امر تھا۔ وہ بہت ابتدا میں شعر کہنے لگے تھے۔ اگرچہ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس میں کسی سے مشورہ نہیں کیا، نہ کسی سے اصلاح لی، لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ شروع میں انھوں نے ضرور سیاب اکبر آبادی سے اصلاح لی۔ ممکن ہے بعد کو مشورہ لینا ترک کر دیا ہو۔ شعر کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ ”جنت ایکسپریس“ دورانِ جنگ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں زیاکار مذہبی حلقوں کے بارے میں طنزیہ افسانے ہیں۔ دوسرا مجموعہ ”آئینے“ کے عنوان سے چھپا (۱۹۴۳ء)۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ ”زمزمہ حیات“ ۱۹۳۶ء میں ازرد ویرا ”غزالی“ غزل ”فیروز سنز کی طرف سے مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس پر انھیں مارچ ۱۹۶۹ء میں صدر مملکت کی طرف سے ”آدم جی ادبی انعام“ (پانچ ہزار روپے) عطا ہوا۔ انھوں

نے کسی زمانے میں بچوں کی درسی کتابیں بھی خاصی تعداد میں لکھی تھیں۔ سنا ہے کہ انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے، اگرچہ یہ میری نظر سے نہیں گزرے۔ انھیں لغت اور صرف و نحو سے بھی غیر معمولی شغف تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ نئی نئی ترکیبیں وضع کرتے اور انھیں اپنے شعروں میں استعمال کرتے۔ اس سے ان کے کلام میں بانگین اور ایک طرح کی تازگی اور سرستی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

انھیں علم نجوم اور جفر میں بھی غیر معمولی ہارت حاصل تھی۔ وہ اکثر اپنی پیشگوئیاں اخباروں میں شائع کر دیتے تھے؛ اور حیرت ہے کہ ان میں سے بیشتر صحیح ثابت ہوتی ہیں۔

ان کی زندگی بابر بعیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست کی عملی تفسیر تھی۔ انھوں نے مقدّم بھرا اپنی شمع حیات دونوں سروں سے جلائے رکھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ان کی شاعری میں لذت اور ابقوریت کی جو فراوانی ہے، تو یہ نہ محض سخن گسترانہ بات ہے، نہ شاعرانہ مبالغہ۔ انھوں نے ایک شعر میں اپنی زندگی کی تصویریں کھینچی ہے:

ہم سارندب باکرامت، کیا کوئی ہوگا کہ ہم دن کو درویشی کریں، راتوں کو سلطانی کریں  
اور یہ امر واقع ہے۔ باکرامت درویشی کا یہ عالم تھا کہ واقعی دن بھر اصحاب علم کی صحبت میں تصوف اور اخلاق کے مسائل پر مصروف سخن رہتے۔ بیسیوں نادار اور سیرالحال ادیب اور شاعران کے وظیفہ خوار تھے۔ متعدد غریب طالب علم ان کی نیامی کی بدولت تعلیم پا کر اپنے پانوں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ جب بھی ان میں سے کوئی صاحب ان سے ملنے کو آجاتے، تو وہ ان کی پذیرائی میں بچھے جاتے۔ لیکن شام ہونے کے ساتھ ہی ان کی قلب ماہیت ہو جاتی؛ اب ان کی شخصیت ایک دوسرے روپ میں جلوہ گر ہوتی اور وہ اپنے اس شعر کی تصویر بن جاتے:

فرش گل بچھو اٹیں، رنگ و بو کی ازرائی کریں او، بلقیسانِ دوراں سے سلیمانی کریں  
ان کے کلام میں شکوہ ہے۔ انہوں نے مختلف رنگین ترکیبوں کے پردے میں تلذذ اور نشاہوں  
کی باتیں ایسے دلکش انداز میں کی ہیں کہ شاید عام حالات میں نظر ان کی گہرائی تک نہ پہنچے۔ چند  
شعر ملاحظہ ہوں:

عرشِ خم سے شراب اترتے دیکھی	روحِ مہ و آفتاب اترتے دیکھی
مینخانے کی اصلاح نہ دیکھی گویاں	ہر روز نئی کتاب اترتے دیکھی
وہ میں تھا ہوشوں سے سلامت گذریا	یہ تجربہ کرو نہ کسی پاکباز پر
یوں زندگی پہ میری نظر ہے کہ جس طرح	اک جسمِ مرمریں کے نشیب و فراز پر
عشق ہو عشق، تو دوری میں مگی ہے لذتِ خاص	اس کا اسکاں کہ یہ دوری کبھی کم ہو، نہ سہی
سجدہ شوقِ غنیمت ہے، جہاں ہو جائے	اس میں یہ شوق کہ محرابِ حرم ہو، نہ سہی
ہر ایک چیز جواں تھی جو آج صبح کو ہم	کنارِ شاہدِ نوحیز و نوجواں سے اٹھے
ادھر غزالِ حرم ہیں، ادھر بتانِ کشتہ	ہے کشمکش میں قیامت کہ اب کہاں گئے
مینخانے سے چلی تھی کوئی بیخودی کی بات	اگر حرم میں کشف و کرامات ہو گئی
اتری نہ تھی سبوں میں، تو کچھ بھی نہ تھی شراب	اتری سبوں میں، معرفتِ ذات ہو گئی
غم جہاں کہ بلا ہو گیا ہے سب کے لیے	مرے سپرد کرو اس کو ایک شب کے لیے
دراز دست ہی پہنچے یہاں مرادوں کو	نہیں، دولتِ زلفِ دراز سب کے لیے
آساں نہیں تلاشِ حرمِ جمالِ دوست	کچھ دن جلاؤ شمعِ مہ و آفتاب اور
جانے، کیا کیا مدارج اور ابھی کرنے میں طے	ہم ابھی ذہینِ خداوندی میں اک اندیشہ ہیں
نخست و سنگِ ناتراشیدہ سے ابھر اخطِ حسن	میگساروں کی نگاہیں ہیں کہ طربِ تیشہ ہیں
بت پرستی کیجیے اس شدتِ احساس سے	سنگ میں بھی جزوِ احساس و خبر رکھ دیجیے
آیا نظر جہاں کوئی بھٹکا ہوا غزال	ہم بھی بڑے خلوصِ دلی سے بھٹک گئے
کھینچی اگر تو ہوش میں کھینچینگے زلفِ دوست	منظورِ بیخودی کا سہارا نہیں ہمیں
زاہد کو خاتقاہ میں ملتی کہاں شراب	لیکن کچھ اہتمامِ رسد ہم نے کر دیا



ہر ایک قطرہ ہے میری نگاہ میں بجز شعور  
 پہنچ کے پردہ اسرار تک میں لوٹ آیا  
 اس کے سوا کچھ اور نہیں راز کائنات  
 اسرار زندگی سے جو پردہ اٹھائیں ہم  
 وہ پردہ اسرار ہو، یا پردہ محل  
 میں گردشِ ایام پہ مرتاہوں کہ اس میں  
 دیکھا ہے، ظفر! تجھ کو خرابات میں ہم نے  
 اربابِ نظر دیکھے، پیرانِ حرم دیکھے  
 خلوت میں نہیں جن سے امیدِ کرم کوئی  
 آنکھیں کھلی ہیں اور زباں پر ہے قفلِ ضبط  
 اے دوست! اس زمان و مکان کے عذاب میں  
 نہ پوچھو شوق کا عالم کہ شہرِ خوباں میں  
 نیاز کا ہے یہ عالم کہ جب خدا نہ ملا  
 یارب! کبھی نہ ملے ہو مری راہِ اشتیاق  
 اب دل کے زیاں پر ہو سز نقد و نظر کیا  
 آیا نہ میرے ہاتھ جو وہ شاہدِ مراد  
 پھر پریشاں ہو کوئی زلفِ سخن بو اور ہم  
 ادھر یہ دیر قیامت میں تھی کہ ہو کرتے  
 مقابلے میں جو آتی تو ہم سے دست دراز  
 ہم اس جہاں میں تھے کل شب کسی کے ساتھ کہ لوگ  
 ہمایے دوش پر کھلتی، تو تیری زلف سے ہم  
 خلوتِ شب میں جو درپے بوز لچاے بہار  
 کہاں کے دیر حرم، آؤ ایک سجدہ ہوش

ہر ایک ذرہ ہے دنیا سے آگہی مجھ کو  
 نہ تھی پسند ملائک کی ہمرہی مجھ کو  
 اک ذرہ جمال برافر و خستہ ہوا  
 اپنے سوا کسی کو نہ موجود پائیں ہم  
 ہاتھ اپنے پہنچ جائینگے بے اذن و صلا بھی  
 خوبو بھی تری ہے، ترے انداز و اداب بھی  
 تجھ کو بھی ہے دعویٰ کرامت، ارے اجا بھی  
 زندوں کی طرح لیکن، پہنچے ہوئے کم دیکھے  
 جلوت میں کوئی ان کا اندازِ کرم دیکھے  
 یہ حکم ہے کہ دیدہ وری کی زکات دے  
 دشمن ہے جو کسی کو دعا سے حیات دے  
 ملا جو شخص، ہوا مجھ کو آشنا معلوم  
 ہمیں پرستش بت بھی ہوئی بجا معلوم  
 جو بھی قدم اٹھے، قدم اولیں رہے  
 اب ان سے گریزاں ہو تو ہے دل کا زیاں او  
 اپنے ہی اشتیاق سے میں ہم بغل ہوا  
 رات بھر تحقیق اسباب پریشانی کریں  
 ادھر سے منجھے دوڑے سبوسو کرتے  
 خراب گردشِ دوراں کی آبرو کرتے  
 صبا کی طرح بھٹکتے جو جستجو کرتے  
 نسیم صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے  
 ہم نہیں یوسف کہ عذرِ پاک دامانی کریں  
 بیادِ ہوش ربایانِ بستان سالہ کریں

آئیے طوطیوں کی طرح بولتے رہے  
جیسے کسی کا بند تھا کھولتے رہے  
راتوں کو جو سرور میں ہم بولتے رہے  
اسرارِ کتمِ راز میں پر تو لتے رہے  
ہم اس میں نورِ صبحِ ازل کھولتے رہے  
تسبیحِ زلفِ ماہوشاں رولتے رہے  
خطِ سبویہ کون و مکاں ڈولتے رہے

اس نے کہا، یہ رات سپردِ بتاں کرو  
اس نے کہا، تعاقبِ لالہ رُحساں کرو  
اس نے کہا کہ نذرِ زلیخا و شتاں کرو  
اس نے کہا، شراب سے طہیٰ مکاں کرو  
اس نے کہا، وظیفہٴ اہم بتاں کرو  
اس نے کہا کہ آرزوے رائگاں کرو  
اس نے کہا کہ از سر نو استحاں کرو  
اس نے کہا، نہ اس میں چین و چناں کرو  
اس نے کہا کہ خدمتِ پیرِ مغان کرو  
اس نے کہا کہ ترکِ رسومِ جہاں کرو  
اس نے کہا کہ اور اسے سرگراں کرو  
اس نے کہا کہ ہم سے نہ دل بدگماں کرو  
اس نے کہا، یہ بات یہاں کم بیاں کرو  
اس نے کہا کہ دعوتِ روحانیاں کرو

عکسِ جمالِ یار بھی کیا تھا کہ دیر تک  
کیا کیا تھا حلِ مسئلہٴ زندگی میں لطف  
تا صبحِ جبرئیل کو از بر تھا حرفِ حرف  
کل شب ہمارے ہاتھ میں جینا تک سیور ہا  
ہر شب شبِ سیاہ تھی، لیکن شراب سے  
ہم مبتقی شہرِ خراباں، رات بکھر  
کل رات میکشوں نے تو ازن جو کھودیا

میں نے کہا کہ حلِ معامے جہاں کرو  
میں نے کہا، بہارِ ابد کا کوئی سراغ؟  
میں نے کہا کہ یوسفِ دلِ ناخبریدہ ہے  
میں نے کہا کہ فاصلہٴ شوق ہے عظیم  
میں نے کہا، کشائشِ مشکل ہو کس طرح؟  
میں نے کہا کہ صرفِ دلِ رائگاں ہے کیا؟  
میں نے کہا کہ عشق میں بھی اب مزا نہیں  
میں نے کہا کہ بابِ مشیت میں کیا ہے حکم؟  
میں نے کہا کہ اور کوئی پسند خوشگوار؟  
میں نے کہا کہ خیر بھی ہے، رسمِ شرب بھی رسم  
میں نے کہا کہ ہم سے زمانہ ہے سرگراں  
میں نے کہا کہ رُخ سے اٹھاؤ نقابِ راز  
میں نے کہا کہ زہدِ سراسر فریب ہے  
میں نے کہا غزل نے بچھایا ہے خوانِ لطف

میں نے کہا کہ حدِ ادب میں نہیں ظفر

اس نے کہا، نہ بند کسی کی زباں کرو

## عبدالقہار صدیقی پروفیسر

۱۸۸۵ء میں سندیلہ (ضلع ہردوئی۔ یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم گلبرگہ اور حیدرآباد میں ہوئی۔ ہائی اسکول کے بعد ایم۔ اے، اوکالج، علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند لی جس سے یہ کالج اس وقت ملحق تھا۔ دو سال تک اسکول کی ملازمت کرنے کے بعد وہ دوبارہ علی گڑھ پہنچے اور یہاں ایم۔ اے (عربی) کے درجے میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں یہاں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر جوزف ہور وڈنر (ف: فرنکفرٹ، ۵ فروری ۱۹۳۱ء) عربی پڑھاتے تھے۔ صدیقی صاحب اپنی قابلیت اور عربی سے فطری مناسبت کے باعث جلد ہی استاد کے چہیتے بن گئے۔ ۱۹۱۲ء میں ایم۔ اے اس امتیاز سے پاس کیا کہ انھیں یورپ میں عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حکومت ہند کی طرف سے وظیفہ ملا۔

۱۹۱۲ء میں جرمنی گئے۔ یہاں انھوں نے سٹراس برگ اور گیوٹنگن کی یونیورسٹیوں میں مشہور زمانہ مستشرقین نولڈیک، تھمب، لٹمن اور آندر یاس کی نگرانی اور رہنمائی میں عربی کی تعلیم پائی۔ ابھی تعلیم کے تمام مراحل کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اگست ۱۹۱۴ء کے آغاز میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی، جس میں ایک فریق جرمنی تھا۔ اور دوسرا انگلستان چونکہ صدیقی صاحب برطانوی رعایا تھے، اس لیے ان کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی گئی اور ان کا جرمنی سے باہر جانا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یوں انھیں ۱۹۱۹ء تک جبراً جرمنی میں رکنا پڑا۔

ایسے حالات میں انسان بالعموم مایوسی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے، لیکن صدیقی صاحب

پر حصولِ علم کا جوشہ چڑھ چکا تھا، اسے جنگ کی ترشی نہ اتا سکی۔ انھوں نے جرمنی میں اس جبری قیام کے زمانے میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھی۔ پہلے ۱۹۱۶ء میں لاطینی زبان کا امتحان پاس کیا، پھر ۱۹۱۷ء میں گیٹنگن یونیورسٹی سے خاص امتیاز سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: کلاسیکی عربی میں فارسی کے ذیل الفاظ۔ انھوں نے اسے جرمن زبان میں قلمبند کیا تھا، اور یہ اسی زمانے میں جرمنی میں چھپا تھا۔

۱۹۱۹ء میں ہندستان واپس آئے اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں ایم۔ اے، او کالج، علی گڑھ میں عربی کے لیسرچ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ لیکن انھوں نے یہاں مشکل سے آٹھ نو مہینے کام کیا ہو گا کہ حیدرآباد سے دعوت نامہ آ گیا۔ یہ وہاں پہنچے اور ستمبر ۱۹۲۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج (کلیئہ جامعہ عثمانیہ) کے پرنسپل بنا دیے گئے، جو اس سے سال بھر پیشتر اگست ۱۹۱۹ء میں قائم ہوا تھا۔ یہاں وہ چار برس (یعنی ۱۹۲۲ء تک) رہے۔

۱۹۲۲ء میں وہ حیدرآباد سے ڈھا کہ یونیورسٹی کے بلاوے پر شعبہ عربی و علوم اسلامیہ کے صدر بن کر وہاں چلے گئے۔ وہ ڈھا کہ ہی میں تھے، جب انھوں نے بمبئی یونیورسٹی کی درخواست پر زبان کے مسئلے پر پانچ ولسن خطبات دیے تھے۔

ڈھا کہ میں تقریباً چار برس کے قیام کے بعد وہ ۱۹۲۸ء میں صدر شعبہ عربی و فارسی کی حیثیت سے الہ آباد آئے۔ اسی زمانے میں ضویبہ متی رہ کی حکومت نے الہ آباد میں ہندستانی اکیڈمی قائم کی اور اکیڈمی کی طرف سے ایک سماہی رسالہ بھی ہندستانی نام کا جاری ہوا۔ اپنی منصبی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ، ڈاکٹر صدیقی ان دونوں کے بھی روح رواں تھے۔ وہ مدتوں اکیڈمی کی مجلسِ عاملہ کے بھی رکن رہے۔ ان کا آل انڈیا اور نیل کالفرنس سے بھی بہت پرانا تعلق تھا؛ وہ دس برس تک (۱۹۲۲-۱۹۳۲) اس کی عاملہ کے رکن رہے۔ اور انجمنِ لسانیات کے تو وہ بانیوں میں سے تھے۔ الہ آباد آنے کے بعد وہ کہیں اور نہیں گئے۔ طویل اور کامیاب دورِ ملازمت



کے بعد ۱۹۴۶ میں یہیں ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو الہ آباد یونیورسٹی نے انہیں اپنا پہلا ایمرٹس پروفیسر مقرر کر دیا۔ اب انہوں نے پرانے الہ آباد کے مضافات کی بستی راجہ پوری میں گنگا کے کنارے ایک وسیع اور پُر فضا مکان تعمیر کر کے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ الہ آباد کے بڑھنے سے راجہ پور اب شہر کا ایک محلہ بن گیا ہے۔

ان کی طویل علمی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ نے انہیں سند امتیاز اور خلعت اور ڈھائی ہزار روپیہ سالانہ کا حین حیات وظیفہ دیا۔ یہ انہیں راشٹری بھون کی ایک خصوصی تقریب منعقدہ ۲۸ اپریل ۱۹۶۲ میں عطا کیا گیا تھا۔

کئی برس سے تندرستی بہت خراب چلی آرہی تھی۔ آخری تین چار برس میں حافظہ بالکل جواب دے گیا تھا؛ بلکہ ہوش و حواس بھی متاثر ہو گئے تھے، جس سے یہ علم و فضل کا پتلا اور باغ و بہار شخص جسدِ بے روح ہو کر رہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اہل انجام اب بہت دور نہیں ہے۔ اس کے باوجود جب خبر ملی کہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء شب کے ساڑھے نو بجے ان کا الہ آباد میں انتقال ہو گیا، تو دل کو دھچکا لگا۔ اتالیق و اتالیقہ راجعون۔ جنازہ اگلے دن ۲۹ جولائی کو اٹھا؛ اور انہیں راجہ پور کے قبرستان میں جو نیوادہ گاؤں سے ملحق ہے، سپردِ خاک کیا گیا۔

اولادِ جسمانی میں دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑے؛ محمد مسلم اور محمد زہیر۔ محمد مسلم صاحب یہاں ہندوستان میں ہیں، الہ آباد میں رہتے ہیں۔ چھوٹے محمد زہیر پاکستان چلے گئے، وہاں کراچی میں قیام ہے۔

ان کی علم و ادب سے عموماً اور اردو سے محبت خصوصاً کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے بانیوں میں تو نہیں تھے، لیکن اس کے استحکام اور ترقی اور کامیابی میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ اردو کے پُر جوش اور سرگرم حامی تھے۔ اور آج کل کے سہل انگار اور مغرب زدہ اصحابِ علم کے شیوہ عام کے خلاف تقریر و تحریر میں بے ضرورت انگریزی الفاظ کے استعمال کے سخت



مخالف تھے۔

انہیں اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ پڑھنے والا ان کی تحریر کو ٹھیک پڑھے اور اسے صحیح تلفظ میں کوئی دقت نہ ہو۔ اسی لیے وہ اپنی ہر ایک تحریر، خطوں سمیت اعراب سے مزین کرتے تھے۔ اہل علم ان کے بعض اصول تھے، جن پر وہ سختی سے کاربند رہے۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۲۱ء میں اہل علم کے قاعدے وضع کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولوی عبدالحق (ف، اگست ۱۹۶۱ء) نے ملک کے اہل علم کی رائے اور مشورہ معلوم کرنے کے لیے ان کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیجا۔ آخر میں جن اصولوں کا فیصلہ ہوا، وہ پیشتر صدیقی صاحب کی آرا پر مشتمل تھے۔ یہ فیصلہ انجمن کے سماہی رسالے اردو میں شائع کر دیا گیا تھا۔ (اردو (۱۹۲۳) ۳: ۵۸۱) لوگوں نے اس سے بے اعتنائی برتی اور اس پر عمل نہیں کیا۔ لیکن اس کے بعد کم از کم انجمن کی مطبوعات اسی اصول کے مطابق چھپتی رہیں۔

ڈاکٹر صدیقی تقریباً تمام سامی زبانوں پر حاوی تھے۔ ان کے علاوہ یورپ کی بعض زبانیں بھی جانتے تھے۔ ان کا علم و فضل اور وسیع مطالعہ ہر ایک متلاشی علم کی خدمت کے لیے ہمیشہ حاضر رہتا۔ کوئی صاحب اپنی تصنیف کے لیے کسی قسم کی معلومات طلب کرتے۔ وہ گھنٹوں اپنے کتابخانے میں مطالعہ کر کے موضوع سے متعلق مواد جمع کرتے اور اسے پوری تفصیل اور وضاحت سے قلمبند کر کے سائل کو ہتیا کر دیتے۔ کوئی دوسرے بزرگ اپنی تصنیف ہدیہ بھیج کر اس کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرنا چاہتے۔ وہ کتاب کو غور سے پڑھ کر نہ صرف موضوع ہی سے متعلق لکھتے، بلکہ اہل علم، اعراب، کتابت اور صفحوں کے اغلاط تک کی نشاندہی کر دیتے۔ میں نے بعض اصحاب کے پاس ان کے ۲۰-۲۵ اور ۲۵-۳۵ صفحات کے بلکہ اس سے بھی طویل تر خط دیکھے ہیں۔ کہاں ٹپکنے اب ایسے اصحاب جن کا اور ہونا اس حد تک خالص علم ہی ہوگا! کاشکے کوئی اللہ کا بندہ ان کے خطوط جمع کر کے شائع کر دے، بے بہا معلومات کا خزانہ ہونگے یہ۔

افسوس، ان کی کوئی قابل ذکر مطبوعہ کتاب نہیں ملتی۔ ان کا نفاست اور تکمیل کا معیار اتنا بلند تھا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق نہ کوئی کام پورا کر سکے، نہ اس کی طباعت سے مطمئن ہوئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کے مسودات میں دیوانِ بیان اور نامہ غالب کے مکمل مسودے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بیش قیمت مضامین کی بڑی تعداد مختلف رسائل و جرائد میں بکھری پڑی ہے۔ اگر اسخیں بھی جمع کر کے ایک دو جلدوں میں شائع کر دیا جائے، تو کیا عجوب کہ یہ اس دیرینہ خادمِ علم و ادب کا نام آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں۔ رہے نام اللہ کا۔

## تاج قریشی حیدرآبادی، محمد تاج الدین

۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ (۲۷ اپریل ۱۹۱۲ء) کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد امیر الدین قریشی پایگاہ آسمانجاہی کی فوج میں کپتان تھے؛ اور خود بھی چھوٹے موٹے جاگیردار تھے۔ اس لیے تاج، گویا منہ میں چاندی کا چمچہ لیے پیدا ہوئے، جس سے ان کا بچپن اور جوانی کا زمانہ بیفکری اور بے حد آرام و آسائش میں بسر ہوا۔ اردو اور فارسی کی حد تک تعلیم بھی گھڑی پر ہوئی۔

شعر گوئی ۱۶ برس کی عمر میں شروع کی اور اس میں سید علی احمد زیرک قنوجی (ف ۱۹۳۱ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد نادر علی برتر سے سلسلہ تلمذ قائم کیا۔ برتر خود نواب میرزا ظہیر دہلوی (ف مارچ ۱۹۱۱ء) کے شاگرد تھے۔ اس طرح وہ ذوق کے خاندان میں شامل ہو گئے۔

ان کا ایترائی زمانہ جس عیش و عشرت میں گذرا تھا، آخری اتنا ہی عسرت اور کلفت میں بسر ہوا۔ منصبداری اور جاگیر ختم ہوئی، تو اسی کے ساتھ آمدنی کے تمام ذرائع بھی مسدود ہو گئے۔ اور کوئی کام کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سیم و جان کا رشتہ بجال رکھنے کے لیے رفتہ رفتہ اثاثا البیت تک فروخت ہونے لگا؛ اور بالآخر انھیں اپنے وسیع جدی مکان سے اٹھ کر ایک دوسرے محلے میں چھوٹے سے مختصر مکان میں جانا پڑا۔ ان مسلسل مشکلات کے باعث صحت مستقلاً خراب رہنے لگی۔ دوستوں اور مداحوں نے کچھ خبر گیری ضرور کی، لیکن بے درپے ذہنی اور جسمانی پریشانیوں نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا۔

پرائی تنقہس کی شکایت نے شدت اختیار کر لی، تو اولاً گھڑی پر علاج شروع ہوا؛ لیکن جب مسلسل کئی مہینے کی دوا دوش کے باوجود افاتے کی کوئی صورت نظر نہ آئی، تو سب طرف سے مایوس ہو کر دواخانہ عثمانیہ (حمید آباد) میں داخل ہو گئے۔ وہیں منگل، ۵ ستمبر ۱۹۷۲ء دن کے ساڑھے دس بجے جان بحق ہوئے۔ تجہیز و تکفین بھی اجاب نے کی۔ اسی دن نمازِ عشا کے بعد درگاہِ حضرت برہنہ شاہ کے قریبی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

افسوس، ان کا مجموعہ کلام زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ ۵۰ برس میں جو کچھ کہا، اور یہ خاصی مقدار میں ہے، ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری مرحوم (ف ۱۹۷۲ء) نے اپنی زندگی میں ان سے خاص طور پر منظوم تاریخ دکن لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ دراصل انھوں نے اس طرح بالواسطہ ان کی مالی امداد کرنے کا بہانہ پیدا کرنا چاہا تھا۔ لیکن تاج ان کے جیتے جی کام شروع نہ کر سکے۔ شرط یہ تھی کہ ہر مہینے کم از کم ۵۰ اشعار ضرور کہیں گے، جن کے لیے ادارہ ادبیاتِ اردو (حمید آباد) کی طرف سے ان کی خدمت میں پچاس روپے پیش کیے جائیں گے۔ تاج نے کام زور کی رحلت کے بعد شروع کیا اور ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۹ء تک تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار اشعار کہے۔ یہ دراصل دو طویل نظمیوں پر عہدِ قطب شاہی سے متعلق کوئی پانسو شعر ہیں، جن کا قافیہ عیار، شعار وغیرہ ہے۔ بعد کے زمانے کے بارے میں گیارہ ہزار شعر ہونگے باقیہ دعا، مہا، گیا کی زمین میں ہیں۔ افسوس کہ اس کے بعد جلد ہی خود ادارہ ادبیاتِ اردو کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی اور اس میں تاج کو ماہانہ وظیفہ ادا کرنے کی استطاعت ہی نہ رہی۔ اس پر انھوں نے کام بند کر دیا۔ بہر حال اس نامکمل منظوم تاریخ کا مسودہ ادارہ ادبیاتِ اردو کے کتابخانے میں موجود ہے۔

تاج قدیم وضع کے پختہ گوشاعر تھے۔ لیکن جدید خیالات سے کبھی بھڑکتے نہیں تھے۔ خود ان کی اپنی غزلوں میں ہم عصر سیاست کی طرف تک اشارے ملتے ہیں۔

حیدرآباد میں ان کی بدولت اردو شاعری کا جو چراغ روشن تھا، وہ ان کی وفات سے گل ہو گیا۔ چوں کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا ہے، مشکل سے چند شعر مہیا ہو سکے۔ ملاحظہ ہوں:

اسکتی ہے دل میں ہوک سی، ہوتا ہے اختلاج سا

پچھلے دنوں نہ تھا کبھی حال خراب آج سا

کیسا کمال ان کے خدنگِ نظر میں ہے  
کیا جانے ان کے فضل و کرم کے مقام کو  
مضمون بلند کیوں نہ ہوں میری غزل میں سماج!  
موج گرداب کے مرکز سے گریزاں ہو کر

تھا ان کے پاس ابھی، ابھی میرے جگر میں ہے

واعظا ابھی تو مسئلہ خیر و شر میں ہے

شانِ کلام حضرت برتر نظر میں ہے

سر کو ٹکراتی ہے ساحل سے پریشاں ہو کر

بلا مشاقِ فطرت کھیلتی رہتی ہے طوفاں سے

مصائبِ دوستِ نظریں رخ نہیں کرتی ہیں ساحل کا

علوِ نظر فی سلامت، بات رکھتی ہیں نے ساقی کی

اٹھایا جامِ یوں مہنس کر کہ سب لبریز ہی سمجھے

شیخ کے دل میں نہ اخلاص، نہ الفت، نہ گزار

صرف احرام ہی احرام ہے، کیا عرض کریں

تدغیرتِ شمشاد ہے، لبِ غنچہ، دہن پھول

گلچیں کا ہے شکوہ، نہ عنادِ دل کی شکایت

نکبت کبھی پابندِ گلستاں نہیں ہوتی

پروردہ آغوشِ بہاراں ہیں یہ دونوں

سر تا بقدم ہیں وہ بہاراں اور ہمہ تن پھول

ہیں عاملِ پابندیِ آئینِ چمن پھول

گو پاسِ وفا سے ہیں محصورِ چمن پھول

ہیں فخرِ چمنِ خار، تو ہیں نازِ چمن پھول

نہیں کٹی ہیں کائے سے غم و آلام کی گھڑیاں

یہ دیکھا ہے کہ پیر لگتے ہیں عشرت کے زمانے کو

چمن میں، میں بھی رہتا تھا، چمن میں وہ بھی رہتے تھے

گلستاں کو میں روتا ہوں، عنادِ آشیانے کو



زرا اتار کے تو دیکھیے لباس بہار  
ہوا کی طرح سے اڑنے لگے حواس بہار  
بہار پر نہ کریگا کوئی تیساں بہار  
چٹکنا پختوں کا گویا، ہے التماس بہار  
کہ اختتام خزاں ہی پہ ہے اسماں بہار  
نگاہ جس کی نہیں ہے اداسناں بہار  
ہے ایک جان چمن سے، یہ التماس بہار  
اسی کو کہتے ہیں، اے تاج اقباس بہار

بیشک ہیں عجب خالق ماحول چمن پھول  
چمکاتے ہیں، بیشک وہی تقدیر چمن پھول  
کیا طوق کوئی ہا رہے، کیا دار و سن، پھول؟  
سچ جانے، ہیں واقف انجام چمن پھول  
کھلتے ہی جو موحاتے ہیں محروم چمن پھول  
ہے پردہ دار عجب میکرہ کا دروازہ  
کسی پہ بند نہیں میکرہ کا دروازہ

تخل شامِ غم کے قرباں، تیقنِ روشنی سلامت!  
انق سے اب پھوٹی ہیں کرنیں، سہیگی کیا تیرگی سلامت

ایک دنیا ہے اسی دل کی بدولت دل میں  
آنکھوں میں جس کی مروت، نہ محبت دل میں  
پہچانتی ہے خوب، تری رہگذر مجھ  
تھی کس قدر امید، نمودِ سحر مجھ!  
تو یہ سمجھتی ہے دنیا کہ دل میں درد نہیں  
خزاں کی رت میں بھی خسار جن کے زرد نہیں

چمن کا جسم وہی داغدار و خاک آلود  
گلوں نے چھیڑ دیا جب، خزاں کا افسانہ  
یونہی رہا جو چمن میں فلک خلل انداز  
فریب خوردہ رنگ چمن سمجھتے ہیں  
ہے کس لیے غم تخریب گلستاں، بلبلی!  
لیگا کیا اسے نظارہ چمن کا مسرا  
فقا حسیں ہے، میں حاضر ہوں، آپ بھی آئیں  
نظر میں آگئی رنگینی چمن کھنچ کر

ہر شام نیاروپ ہے، ہر صبح نیارنگ  
جو سینہ سپر ہوتے ہیں یورش پہ خزاں کی  
ہر ایک سے یہ بار اٹھایا نہیں جاتا  
رہتے ہیں خوشی میں بھی جو یہ چاک گریباں  
بن جاتے ہیں وہ، زخم بہاروں کے دلوں کا  
ہے اس کے سینے میں کتنوں کی آبرو پنہاں  
حرم میں ڈیر میں، ہر ایک جا نہیں سکتا

رکھے آباد خدا، میری تمناؤں کو  
کس ستم کیش کو، اے تاج ارباد لہ تم نے  
برسوں دیا ہے آبلہ پا کاخوں سے  
دن میں بھی پھر وہی ہے اندھیروں کی سابقہ  
نغانِ گرم، لب خشک، آہ سرد نہیں  
وہی تو پھول گلستاں کی لاج رکھتے ہیں

رہ و فائیں ہے پلچل کا اس قدر افلاس

کہاں کے نقش قدم، قافلے کی گرد نہیں

آج بھی اس کے سمجھنے کو ہیں حیراں کتنے

آدمی کتنے ہیں اس دور میں انساں کتنے!

پھول ہیں عشرت یک لمحہ پہ شاداں کتنے

یہ ہیں ناواقف انجام گلستاں کتنے!

سوزِ دل سازِ الم، نغمہ جاں، کیفِ حیا

ایک افسانہ الفت کے ہیں عنوان کتنے!

یاد کر کے تجھے آخر شب ڈوب گئے

جھلملاتے ہوئے تارے سرِ شرگاں کتنے!

کبھی حقیقتِ جلوہ کی اک جھلک نہ ملی

بہ زعم دانش و عرفاں بہت دماغِ جلے

ایراغ بھر کے کرو غایتِ طلبِ رندو!

دعا قبول ہوا کرتی ہے چراغِ جلے

کچھ اس ازا سے ہوئے جلوہ گروہِ محفل میں

کسی چراغِ بجھے، اور کسی چراغِ جلے

سدیثِ چھڑے، نذرتِ شکرِ چلے

بصدِ خلوص، بہ اندازِ دلپسند چلے

یارِ عشق میں یوں ان کے غم پسند چلے

سپاہِ جیسے کہیں، ہو کے فتح مند چلے

رہ حیات میں اکثر تشدیب آئے، مگر

بلند حوصلہ، ہر وقت سر بلند چلے

نہی عنوانِ محبت کی راہ کیا رو کے

کچھ اس کے آگے نہ آئیں تید و بند چلے

یہ تغیرِ فطرت بھی ایک لمحہ فکر

کہ شر کی نکتہ یہ کیوں غایت پر پہلے!

سیرِ ناز میں بھی نقشِ پا چمک اٹھے

کچھ ایسی شان سے تیرے نیاز مند چلے

وہی جہانِ وفا کے ہیں شہرِ یار، اے تاج!

جو درد مند ہے، اور درد مند چلے

## مختار صدیقی، مختار الدین

ان کا خاندان سیالکوٹ (پاکستان) کا رہنے والا تھا، جہاں وہ یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی صغر سنی ہی میں ان کے والدین کو نقل مکان کر کے گوجرانوالہ چلے آئے تھے۔ اسی لیے مختار الدین صاحب کی تعلیم گوجرانوالہ میں ہوئی، اس کے بعد انھوں نے بی، اے کا امتحان اسلامیہ کالج، لاہور سے پاس کیا۔

ملازمت کا پورا زمانہ ریڈیو کی ملازمت میں گزارا۔ اولاً آل انڈیا ریڈیو میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد اسی عہدے پر ریڈیو پاکستان چلے گئے۔ جب وہاں ٹیلی ویژن کا شعبہ قائم ہوا، تو اس میں مضمون نویسی کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی عہدے پر اپنی موت تک کام کرتے رہے۔

قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، جس پر انھیں فوجی اسپتال، لاہور میں پہنچا دیا گیا۔ آٹھ دن وہاں رہے اور کچھ اذاتے کے آثار نظر آنے لگے تھے کہ ۸ ستمبر ۱۹۷۲ء کو یکایک پھر شدید حملہ ہوا۔ اسی دن ساڑھے آٹھ بجے شام انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن (۹ ستمبر) اٹھا اور انھیں قبرستان اچھرہ (لاہور) میں سپرد خاک کیا گیا۔ رات کے قعبے سے تاریخ ہوئی:

از سر زخمِ دلم تا تیغِ صلش شد رقم چوں من شنیدم: راہی ملکِ عدم مختار شد

(۱۹۷۲ = ۱۹۶۵ + ۷)

اپنے پیچھے جسمانی یادگار دولٹ کے اور دولٹ کیاں چھوڑیں۔

انھوں نے علم و ادب کی بڑی قابل قدر خدمت کی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے

سیاب اکبر آبادی سے اصلاح لی تھی۔ وہ بیک وقت شاعر اور ادیب اور نقاد تھے۔ انھوں نے بھی میراجی کے ساتھ حلقہٴ اربابِ ذوق، لاہور میں نئے نئے تجربے کیے، جو اگرچہ نہ سب کا میاب ہوئے، نہ انھیں پسندِ عام کی سند ملی؛ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ انھیں تجربوں کی بدولت اردو شاعری میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔

ان پر تصوف اور خاص کر حضرت سلطان باہو کا بہت اثر تھا۔ کلاسیکی موسیقی میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ چنانچہ ان کی شاعری میں اس کے آثار بہت نمایاں ہیں۔ ان کا مختصر مجموعہٴ کلام ”منزلِ شب“ (لاہور ۱۹۵۵ء) ان کے آہنگ کا نمایندہ ہے۔ اس میں بیشتر نظمیں نغمگی کی فضا اور تاثر کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چینی الاصل امریکی مصنف لِن یوتانگ کی مشہور کتاب کا ترجمہ بھی ”چینی کی اہمیت“ کے عنوان سے کیا تھا۔ ممکن ہے، کچھ اور تصنیفات بھی چھپی ہوں جو میری نظر سے نہیں گذری ہیں۔ انھیں اپنی لیاقت اور صلاحیت کا شدید احساس تھا، اور اس بات کا افسوس کہ زمانے نے ان کی کماحقہ قدر نہیں کی۔ روایت ہے کہ موت سے چند دن قبل ایک دوست مزاج پُرسی کو گئے، تو ان کے حال پوچھنے پر میر کا یہ شعر پڑھا:

ایک محروم پھرے، میر! ہمیں دنیا سے ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کچھ  
یہ چند شعراں کے مجموعے ”منزلِ شب“ سے لیے گئے ہیں:

دیکھیں، بیتاب رہینگے کب تک!	چین دل کو کسی عنوان نہ سہی
وحشتِ آثار، درو بام ہیں کیوں!	یہ مرا گھر ہے، بیاباں نہ سہی
موت کو زلیست ترستی ہے یہاں	موت ہی کو نسبی سستی ہے یہاں
سب خرابے ہیں تمتاؤں کے	کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں
ہم ہی تو تھے عینِ ذات، لیکن	ہونا، ہوا سنگِ راہ اپنا
غم کی اس پیزار کیسانی کا کچھ تو ہو علاج	ہم نہیں کہتے کہ ان سے ہی ملاقاتیں کرو

آٹھ پیر آشفتمہ خیالی، کس کو بھلا خوش آتی ہے! جی مانے، تو ہم بھی کچھ دُجسمعی کا سامان کریں جب سے نفس کا گوشہ چھوٹا، ایک ہی دُگداری ہے جینا مشکل، مرنا مشکل، کیا مشکل آسان کریں میل ملاپ کی باتوں میں، اب سوچتے ہیں دُجسمعی لیں شاید یہ معلوم ہو، کیونکر ہم کو خوئے فراق ہوئی دل ہی کے دم تک فرم کر جینے کے سارے جھگڑے تھے بارے قصہ پاک ہوا ہے، جھوٹے سچے سہاروں کا تیری لگن کے لاگ کے ہاتھوں ہم بچپن کمال ہوئے جتنے ارماں جی میں رہے، وہ اپنے جی کا وبال ہوئے آج کی بات نہیں، ان حالوں ہم کو برسوں گزرے ہیں جوں توں رات گزارے، لیکن دن کو سوا بیکال ہوئے شانِ خدا ہے، آج زمانہ آیا ہم بے ہنروں کا ورنہ اس اک لستی میں بھی کیا کیا اہل کمال ہوئے! گلیاں وہ سنسان ہیں، جن میں تیرا دوانہ پھرتا ہے اس کے بہانے دید کو تیری، سارا زمانہ پھرتا ہے ملکوں ملکوں، شہروں شہروں، اپنے غم کی شہرت تھی یوں درپردہ محفل محفل، تیرا فسانہ پھرتا ہے ساحل پر کیا پہنچے ہم، طوہار سننے ترکیبوں کے پہلے یہ شکستہ کشتی تھی، اور طوفانوں کے ریلے تھے دل زدگاں کے دور سے پہلے، دنیا رستی لستی تھی پھر کچھ چرچے ایسے پھیلے، چین کسے آرام کہاں!



تھی تو سہی، پر آج سے پہلے ایسی حقیر فقیر نہ تھی  
 دل کی شرافت، ذہن کی جودت، اتنی بڑی تقصیر نہ تھی  
 سچ کہتے ہو، ہم ایسے کہاں، اور سوز و گداز شوق کہاں!  
 سچ ہے، مرے آپینہ دل میں کوئی کبھی تصویر نہ تھی  
 یہ تسلیم ہے گا ہے کچھ دلچسپی رہتی ہے  
 ورنہ تیسری دنیا میں بھی، کوئی ہمیں آرام نہیں  
 سچ کہتے ہیں منزل والے، ہم میں گداز شوق نہ تھا  
 سچ ہے، انھیں کے اشک تھے موتی ان کی آپیں آپیں  
 اب کچھ بھی نہیں ہیں، یعنی اگر درویشوں میں بیٹھے ہیں۔  
 دن وہ تھے، جب اپنے بھی سر پر ٹیڑھی ترچھی کلاہیں تھیں  
 نکتہ وروں نے ہم کو سبجایا، خاص بنو اور عام رہو  
 محفل محفل صحبت رکھو، دعیا میں گم نام رہو  
 یہ بھی کرامت ہوگی شاید اس اقا و طبیعت کی  
 ورنہ دل سے کس نے کہا تھا، یوں مغموم مدام رہو

## پنہاں بریلوی، سپہر آرا خاتون عرف رابعہ

بریلی کے ایک سربراہ اور وہ علمی خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے والد مولوی عبدالاحد صاحب کا شہر کے معزز لوگوں میں شمار تھا، ان کی سکونت گچھیر عبد القیوم خان محلہ شاہ آباد (بریلی) میں تھی۔ مولوی عبدالاحد مولوں ڈائریٹر رشتہ تعلیم الہ آباد کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ ان کی چار صاحبزادیاں تھیں، اور حسن اتفاق سے چاروں شاعرہ: بڑی آمنہ خاتون، نفیسہ، منجھلی سپہر آرا خاتون عرف رابعہ پنہاں، منجھلی بلقیس جمال، جمال و جمالہ سب سے چھوٹی طہسن آرا بیگم عرف میونہ کا تخلص غزالہ تھا۔

سپہر آرا رابعہ پنہاں ۷ اگست ۱۹۰۶ء کو سہارنپور میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیم سہارن گھر پر اور وہ بھی بیشتر اپنے والد سے ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اردو اور فارسی کے بعد انگریزی بھی پڑھی۔ چونکہ گھر کا ماحول علمی تھا، اس لیے ان کا اس سے متاثر ہونا لابد تھا۔ ابھی کم عمر تھیں کہ اردو میں مضمون لکھنے لگیں۔ سولہ برس کی تھیں کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو پہلے کوئی سال بھر کے لیے، ماجد علی صاحب سے اور بعد میں طالب علی طالب الہ آبادی (ایم۔ اے۔ ایل ایل بی، ایڈووکیٹ، الہ آباد) سے مشورہ رہا۔ ماجد علی صاحب نے نظم و نثر میں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔

۱۹۲۵ء میں مولوی عبدالاحد کا انتقال ہو گیا، جس کے بعد خاندان کو الہ آباد کی سکونت ترک کر کے واپس آبائی وطن بریلی آنا پڑا۔ تین سال بعد ۱۹۲۸ء میں اپنے ایک قریبی عزیز صوفی صغیر حسن صاحب (پرنسپل اسلامیہ کالج، الہ آباد)

سے عقدِ نکاح ہو گیا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی علمی مذاق کے تھے، اس لیے ہر طرح سے ان کے ذوق کی تکمیل و ترقی میں معاون ثابت ہوئے۔

تقسیم ملک کے بعد خاندان سمیت پاکستان چلی گئیں اور کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں پیر کے دن ۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو انتقال ہوا۔

پنہاں کو اپنے والد (مولوی عبدالاحد) سے شدید محبت تھی۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے

رحلت کی، تو اس سانحے کا انھیں بہت صدمہ ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے

بہت نظمیں کہی تھیں، جن کا مجموعہ 'اشکِ خونی' کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں شائع

ہوا۔ اس صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے میں یعنی تقسیم ملک سے قبل تک ان

کا کلام ملک کے بیشتر رسائل و جرائد میں کثرت سے چھپتا رہا ہے۔ وہ اردو کے

علاوہ فارسی میں بھی خوب کہتی تھیں، نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔

غزل اور نظم اور افسانہ ان کے خاص میدان تھے۔ غرض خوش فکر اور خوش گو شاعرہ

تھیں۔ کلام میں بختگی اور جذبات کی عکاسی ہے۔ افسوس کہ کلام کا کوئی مطبوعہ

مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

تلاش سے جو چند شعر دستیاب ہوئے، نذر ناظرین ہیں:

میں اک طرف ہوں، شکلِ خزاں پایمالِ پاس  
اک سمت وہ بہار کا جلوا لیے ہوئے

عشقِ جنوں نواز چلا بزمِ ناز نسلیں  
اک اضطراب و شوق کی دنیا لیے ہوئے

میری تو ہر نگاہ ہے وقفِ عبودیت  
وہ ہر ادا میں حسنِ کلیسا لیے ہوئے

مرہم سے بے نیاز ہیں، پنہاں! یہ زخمِ دل  
کیا کیا فسوں ہے چشمِ دل آرا لیے ہوئے

دیدنی ہے ترے عتاب کا رنگ  
شیشہٴ چشم میں شراب کا رنگ

شیشہٴ مینا میں پنہاں برق ہے  
حسنِ پرفن آج زیرِ دام ہے

جبیں حسن پر سرخی سی دوڑی  
نگاہِ آرزو نے کر دیا کیا

یہ ہونا بھی بقدر یک نفس ہے  
ہماری ابتدا کیا، انتہا کیا

جفا و ناز کی خوگر ہوں، پنہاں!  
خدا معلوم، ہے رسم و فا کیا

حضرت امیر خسرو کی زمین میں فارسی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

جمالش زینتِ دل بود شب جائے کہ من بودم  
 بچشمِ دہر باطل بود، شب جائے کہ من بودم  
 نگاہم بر تجلائے رُخ آیینہ رخسار کے  
 سرم بر پائے قاتل بود، شب جائے کہ من بودم  
 پُرس از رہر و کامل طریقِ عشق و الفت را  
 سر تلوار منزل بود، شب جائے کہ من بودم  
 چساں دل نحو می سازد زیادم، کیفِ دوشینہ  
 دلم نخمیرِ قاتل بود، شب جائے کہ من بودم  
 خطِ رنگین کہ بر پیشانی بسمل کشیدہ تیغ  
 نشانِ عشقِ کامل بود، شب جائے کہ من بودم  
 خم زلفِ نگارے کرد پنہاں! طرفہ اعجازے  
 خیالم در سلاسل بود، شب جائے کہ من بودم

## محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ

ان کا خاندان اصل میں دہلی وال تھا، جہاں ان کے والد تجارت کرتے تھے۔ محمد اسماعیل مہرولی (دہلی) کے نواحی گاؤں پالی میں ۲ اپریل ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم سراسر دہلی میں ہوئی تھی۔ بالآخر ۱۹۰۸ء میں پانی پت منتقل ہو گئے۔

ان کی ملکی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن وہ صحیح معنوں میں طالب علم تھے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔ جو کئی درسی اور امتحانی تعلیم سے رہ گئی تھی، اسے انھوں نے ذاتی مطالعے سے پورا کیا۔ اور اپنی محنت اور سلیقے سے علمی اور ادبی دنیا میں وہ مقام حاصل کیا کہ ان کا ہمارے صفِ اول کے مصنفوں میں شمار ہوتا تھا۔

انھوں نے ملازمت کا آغاز حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت سے کیا، جہاں وہ اردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ لیکن بنجانے کیوں، اس ماحول میں ان کا دل نہیں لگا۔ جلد ہی وہاں استعفیٰ داخل کر کے مقامی وکٹوریہ میموریل لائبریری میں کتابدار مقرر ہو گئے۔ یہاں سے الگ ہوئے، تو مولانا امالی مرحوم (ف دسمبر ۱۹۱۴ء) کے کتابخانے کے نگران بن گئے۔ یہاں وہ پندرہ برس تک رہے۔

قدرت نے انھیں صحافی اور مصنف بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم ودیعت کی تھی۔ مضمون تو وہ بہت تھوڑی عمر ہی میں لکھنے لگے تھے؛ ان کا سب سے پہلا مضمون پندرہ برس کی عمر میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے اپنا



و اتنی ماہنامہ جام جہاں نما کے نام سے پانی پت سے جاری کیا تھا؛ بعد کو مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی کے مشورے پر انھوں نے اس کا نام بدل کر "کائنات" کر دیا۔ اس کے علاوہ حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت کے ماہنامے "مشعل" کی ادارت بھی ان کے سپرد رہی۔ انھوں نے یہ سب پرچے اس کامیابی سے چلائے کہ چند سال بعد جب ۱۹۳۲ء میں حکومت پنجاب نے دیہات سدھار کے محکمے کی سرپرستی میں جھنگ (حال پاکستان) سے ایک ہفتہ وار پرچہ "عروج" جاری کرنے کا فیصلہ کیا، تو اس کی ادارت کے لیے تقریباً ستر امیداروں میں سے شیخ محمد اسماعیل کا انتخاب ہوا۔ شیخ صاحب نے ادارت قبول کر لی، لیکن شرط یہ رکھی کہ میں اس پرچے میں حکومت کی خوشامد نہیں کرونگا۔

یہ پرچہ بہت کامیاب رہا۔ چھ مہینے بعد لفٹنٹ گورنر ایمرسن کے دفتر سے خط ملا کہ لاٹ صاحب تمہارے کام سے بہت خوش اور مطمئن ہیں؛ تم لاہور آ کر سند خوشنودی لے جاؤ۔ شیخ صاحب نے لاہور جانے اور انگریزوں سے سند قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

انگریزوں کے بارے میں یہ جذبہ مخالفت انھیں اپنے دادا حاجی محمد ابراہیم مرحوم سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ اچھے شاعر، اچھے ناثر اور صوفی مزاج بزرگ تھے۔ ان کی پوری زندگی انگریزی راج کی مخالفت میں گزری۔ یہی شیخ محمد اسماعیل کا بھی مزاج تھا، اگرچہ اس کا مظاہرہ عملی سیاست میں نہیں ہوا۔

انھوں نے سب سے پہلے ایک مختصر رسالہ "لوریاں اور پیدیاں" کے نام سے آل انڈیا محڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی فرمائش پر لکھا۔ یہ اسی زمانے میں چھپ گیا تھا اور اب بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔

وہ حالی اور مرسیڈ کے حالات کے گویا حافظ تھے۔ انھوں نے مولوی عبدالحق مرحوم کے کہنے پر برسوں کی محنت کے بعد حالی کے مضامین جمع کیے؛ اور مسودہ مولوی صاحب موصوف کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب کتاب چھپی، تو انھوں نے اس پر

شیخ صاحب کا نام نہیں چھاپا، بلکہ دیباچے میں لکھا کہ یہ مضمون کچھ میرے اور کچھ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے جمع کیے ہوئے ہیں، حال آں کہ بقول شیخ صاحب اس میں ان کی طرف سے ایک سطر کا بھی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

۱۹۳۵ء میں پانی پتی میں حالی صد سالہ یادگار منائی گئی تھی۔ اس کے محرک بھی دراصل شیخ محمد اسماعیل ہی تھے۔ اس تقریب کی صدارت مرحوم نواب حمید اللہ خان والی بھوپال (ف فروری ۱۹۶۰) نے کی تھی۔ ان کے علاوہ علامہ اقبال (ف اپریل ۱۹۳۸) نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ شیخ صاحب نے اس تقریب کی مکمل روداد ماہنامہ ”حیاتِ نو“ (پانی پتی) میں شائع کی تھی۔ ان کی تصنیف ”تذکرہ حالی“ بھی اسی تقریب کی یادگار ہے۔

تقسیم ملک کے بعد وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں تباہ حال لاہور پہنچے۔ یہاں انھوں نے بسر اوقات کے لیے اپنے قلم کا سہارا لیا اور ماہنامہ ”عالمگیر“ کے مدیر مقرر ہو گئے؛ دو سو روپیہ شاہرہ مقرر ہوا۔ لیکن چند ہی ٹہینے بعد رسالے کے مالک حافظ محمد عالم (ف ۱۶ جنوری ۱۹۵۱) سے اختلاف ہو گیا اور انھیں مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد کہیں کوئی ملازمت نہیں کی۔

انھوں نے کم و بیش سو کتابیں تالیف و ترجمہ کی ہونگی۔ ان میں بعض بڑے معرکے کی چیزیں ہیں۔ مثلاً انھوں نے سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کی فرمائش پر مقالات سرسید (۱۶ جلد) جمع کیے۔ ان کے علاوہ مکتوبات سرسید، مکاتیبِ حالی، انکارِ سلیم وغیرہ ایسی کتابیں ہیں، جن کے بغیر تاریخ ادبِ اردو مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے حالی کی سوانح عمری کے لیے وافر مواد جمع کیا تھا۔ تاریخِ اسلام کی بھی کسی جلد میں قلبند کی تھیں۔ مرحوم عقیدے کے لحاظ سے احمدی تھے۔ انھوں نے کچھ کتابیں اس تعلق سے خود بھی تصنیف کی تھیں اور بعض دوسرے حضرات کی بھی شائع کی تھیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی جو کتابیں مسودوں کی شکل میں رہ گئی ہیں، ان کی بھی خاصی تعداد ہے۔ خدانہ کرے، وہ

ضائع ہو جائیں!

حکومتِ پاکستان نے ان مسلسل علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں دس ہزار روپیہ نقد العام اور تمغہ حسن کارکردگی عطا کیا تھا (۱۹۷۱ء)۔ اس کے علاوہ کئی برس سے انہیں ۲۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ بھی مل رہا تھا۔ غرض مالی پہلو سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لیکن فلک یہ تھوڑی سی عافیت بھی نہ دیکھ سکا۔

عمر کے ساتھ مختلف عوارض تو لازماً بشریت خیال کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن جنوری ۱۹۷۲ء میں ان کے بڑے بیٹے شیخ محمد احمد کی عین شباب میں بمرض تنفس ناگہانی موت نے ان کی کمر توڑ دی۔ پھر سال بھر بعد بیوی داغ مفارقت دے گئیں۔ ان ساختا نے ان کا صبر و سکون تباہ کر کے رکھ دیا۔

آخر عمر میں بہت لاغر ہو گئے تھے۔ حافظہ بھی کمزور ہو چکا تھا۔ اگست ۱۹۷۳ء میں ایک دن بازار میں جارہے تھے کہ ایک سائیکل سے ٹکرائے گئے۔ اس سے بہت زخم آئے؛ کولھے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ جب کسی گھریلو علاج سے فائدہ نہ ہوا، تو میوا اسپتال، لاہور میں داخل ہو گئے۔ عملِ جراحی کامیاب رہا، اور کچھ افاقے کے آثار نظر آنے لگے تھے کہ یکایک نشاِ دم نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ وہیں جمعرات ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء (۳ رمضان ۱۳۹۲ھ) سواپانچ بجے شام راہی ملک بقا ہوئے۔ انا لبتہ وانا الیہ راجعون۔

سوگواروں میں اپنے پیچھے ایک بیٹا شیخ مبارک محمود اور پوتا احمد طاہر (خلف شیخ محمد احمد مرحوم) چھوڑے۔

## سید سخی حسن نقوی امر وہوی

امروہہ (ضلع مراد آباد) کے نقوی سادات کے مورث اعلیٰ مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت (ف رجب ۱۲۸۳ھ / اکتوبر ۱۳۸۱ء) کے والد میران سید علی بزرگ (پسر سید تھنی) دوسری مرتبہ، بے بہرہ فیروز شاہ تغلق (اورنگ زیب اور روایت کے مطابق عنایت الدین بلبن کے زمانے میں) عراق کے شہر واسط سے ہندوستان آئے اور امر وہہ میں بس گئے۔ امر وہہ کی سب سے پہلی تاریخ ۱۸۸۹ء میں مطبع گلزار ابراہیم، مراد آباد سے بعنوان "تاریخ اصغری" شائع ہوئی تھی جس کے مصنف سید اصغر حسین تھے، یہی سید سخی حسن کے پردادا تھے۔ افسوس کہ اس مفید کتاب کا نسخہ اب بہت کمیاب ہو گیا ہے۔

سید سخی حسن کے والد عسکری حسن (عرف میرکلو) زمینداری پیشہ تھے۔ ان کا ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا؛ ابام باڑہ علمدار علی خان (محلہ گزری)، امر وہہ میں دفن ہیں۔

سید سخی حسن یکم نومبر ۱۹۱۴ء کو امر وہہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں امام المدارس ہائی اسکول امر وہہ سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد گھر کی مالی حالت مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سازگار نہیں رہی تھی۔ لہذا انھوں نے بچی کھچی جاو اد پیچ ڈالی تاکہ اس سے تعلیم جاری رکھنے کی سبیل نکل آئے؛ لیکن افسوس کہ یہ بھی نہ ہو سکا۔ اس پرائیویٹ اسکول نے سبھی آرٹ اسکول کی سند کا امتحان دیا اور اس میں کامیابی کے بعد اپنے اسکول ہی میں آرٹ ٹیچر مقرر ہو گئے۔ جب دو سال بعد حالات کچھ بہتر ہو گئے، تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔



یہاں سے یکے بعد دیگرے بی اے (۱۹۳۸ء) اور بی ایڈ (۱۹۳۹ء) کی اسناد حاصل کیں۔ امر وہہ واپس آئے، تو میونسپل بورڈ میں تعلیمی سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ ملا۔ اسی دوران میں انھوں نے نجی مطالعے سے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند لی (۱۹۵۷ء)۔ تین برس بعد (۱۹۶۰ء) میونسپل بورڈ سے رخصت لی اور اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول بمبئی کے پرنسپل کی حیثیت سے وہاں چلے گئے۔ لیکن بمبئی کی مرطوب آب و ہوا اس نہ آئی اور بیمار رہنے لگے۔ بادل ناخواستہ ملازمت ترک کر کے وطن واپس آئے اور دوبارہ اپنی جگہ سلجھا لی۔ ۱۹۶۷ء میں جب امام المدارس ہائی اسکول ترقی کر کے انٹر کالج بن گیا، تو یہ اس کے پرنسپل مقرر ہوئے؛ اپنی وفات کے وقت اسی عہدے پر قائم تھے۔

ان پر قلب کا پہلا دورہ اپریل ۱۹۷۱ء میں پڑا تھا، جب وہ الہ آباد میں کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ دوسرا موت کے چار دن قبل پڑا۔ اس سے کچھ افاقہ محسوس کر رہے تھے کہ اچانک تیسرا شدید ترین حملہ جمعہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء شب میں نوبچے ہوا۔ نصف گھنٹے بعد جان بحق ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن (ہفتہ ۲۱ اکتوبر) اٹھا؛ امام بارگاہ علمدار علی خان میں اپنے والد کے جوازیں سپرد خاک ہوئے۔

پڑھنے لکھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا؛ اس میں خدا داد ذہانت اور ذاتی وجدان ان کے رہنما ثابت ہوئے۔ لکھنے کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ٹیگور کی بعض تحریروں کے ترجمے سے ہوا، جو مختلف مقامی مجلوں میں شائع ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو سے تعلق پیدا ہوا، تو بچوں اور خواتین کے پروگراموں کے لیے بہت کچھ لکھا۔ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے ایک رسالہ 'نئی روشنی' کے نام سے جاری کیا تھا۔ سید سخی حسن اس کے لیے لکھنے لگے۔ بعد کو جب خود اعتمادی پیدا ہوئی اور اجاباب کا حلقہ بھی وسیع ہوا، تو ان کے مضامین اور افسانے دوسرے رسائل و جرائد میں بھی چھپنے لگے۔ ان کے ۱۴ طبع زاد اور مختار مضامین اور افسانوں کا مجموعہ "نک پارے" کے عنوان سے دہلی سے ۱۹۵۲ء



میں شائع ہوا تھا؛ اس کے شروع میں ڈاکٹر سید عابد حسین کے قلم سے چند سطریں  
 ”تقریب“ کے عنوان سے ہیں۔ ان کی کتاب ”ہمارا قدیم سماج“ ان کی موت سے  
 تھوڑے دن پہلے شائع ہوئی تھی۔ ترقی اور دہلی کی فرمائش پرائیڈوں نے  
 پروفیسر تریپاکھی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ”قدیم ہندستان کی تاریخ“ کے نام  
 سے کیا تھا، جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ان کے مضامین کی خاصی بڑی تعداد  
 مختلف رسائل میں منظر پر ہے۔

## مخفی، صالحہ بیگم

۱۹۲۴ء میں کلکتے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے خاندان کا مسقط الرأس پٹنہ تھا۔ جہاں سے ان کے دادا بہار اور بنگال کے اضلاع میں ملازمت کے بعد کلکتہ پہنچے اور وہیں بس گئے۔ مخفی کے والد سید وحید الدین احمد نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور بعد کو کلکتے میں سرکاری ملازم ہو گئے۔ خاندان کا ماحول انگریزی کی تعلیم کے باوجود مذہب اور تصوف کی روایت میں رچا ہوا تھا۔ چنانچہ سید وحید الدین احمد کبھی دفتر سے آتے، تو درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے، اور ان کے ارد گرد اصحاب علم و فضل کا مجمع رہتا۔

خان بہادر نواب محمد تقی پٹنہ کے رئیس اور بااثر اشخاص میں سے تھے، لیکن ان کی ناوقت موت نے گھر کی مالی حالت بہت کمزور کر دی۔ لہذا ان کی بیگم نے پٹنہ کی جاواد بیچ ڈالی اور جو کچھ ملا، اسے اور اپنی دونوں کمنسن بچیوں کو لے کر کلکتہ چلی آئیں۔ یہیں چھوٹی کا عقد نکاح سید وحید الدین احمد سے ہوا۔ بد قسمتی سے وحید الدین احمد کبھی جو انامرگی کا شکار ہو گئے۔ اس وقت صالحہ بیگم بہت کم عمر تھیں۔

صالحہ بیگم کو کسی اسکول میں باضابطہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا جو کچھ حاصل کیا، گھر پر اپنی ذاتی محنت اور لیاقت سے۔ بد قسمتی سے خانگی زندگی بہت المناک رہی۔ پہلی شادی سورت کے ایک صاحب عباس بھائی سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک لڑکی (طاہرہ کلثوم) ہے۔ ان سے علاحدگی کے بعد تعلیمی اور سماجی کاموں میں دلچسپی لینے لگیں۔ چھوٹی بچیوں کے لیے مدرسۃ البنات الغربا (تانی بنگال) اور بڑی لڑکیوں کے لیے ہوڑہ میں ایک یتیم خانہ قائم کیا۔ انھوں نے دونوں ادارے

بحسن و خوبی کامیابی سے چلائے۔ لیکن ذمہ داری بڑھ جانے اور مالی مشکلات کے باعث بعد کو انھیں دوسروں کے حوالے کر دیا؛ یہ لاشتم پشتم آج تک چل رہے ہیں۔ اسی زمانے میں ان کا نکاح ثانی عبدالحی صاحب سے ہوا، جو مقامی پرنسپل ڈیپارٹمنٹ میں انگریزی کے مدرس تھے۔ بد قسمتی سے وہ ۱۹۲۷ء میں جالندھر میں ایک فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہو گئے۔ ان سے دو بیٹیاں (رضیہ بانو اور فاطمہ فرخ) یادگار ہیں۔ اگرچہ تنفس کا عارضہ پرانا تھا، لیکن موت ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اچانک فشارِ دم سے ہوئی۔

انھوں نے شاعری ۱۹۳۲ء میں شروع کی اور اس میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ انھوں نے کسی زمانے میں ہفتہ وار "عبرت" بھی کلکتے سے جاری کیا تھا، جو بہت دن تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں ان کے سلاموں کا مجموعہ جذباتِ محفی کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ نیا شاہکار کے نام سے کچھ افسانے شائع ہو چکے ہیں (کلکتہ ۱۹۵۶ء)۔ اس مجموعے میں افسانے حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ اور تینیس حرفی ان کی خصوصیت ہے۔ مثلاً پہلا افسانہ ہے: الف کا افسانہ۔ اس میں بیشتر الفاظ ایسے ہیں جو الف سے شروع ہوتے ہیں۔ دوسرے افسانے کا عنوان ہے: بے کی بوچھاڑ۔ اس میں استعمال شدہ الفاظ 'ب' سے شروع ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ مختلف اصناف میں کلامِ نظم و نثر کی بہت بڑی مقدار لکھی ہے، جو آج تک شائع نہیں ہوئی۔ یہ مسودات ان کے خاندان میں موجود ہیں۔ کلکتے کے ادبی حلقوں میں ان کی خاصی شہرت تھی، اور خواتین میں تو بلاشبہ وہ صفا اول کی ادیب شمار ہوتی تھیں۔

ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا، اگرچہ دیوان مرتب ہو چکا تھا۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ چونکہ ان کی زندگی بجد پریشانی میں گزری، خاص طور پر خانگی سکون بہت حد تک مفقود رہا، اس لیے ان کے شعروں میں بیچارگی اور تنہائی کا احساس ضرور ملتا ہے۔ ایک نظم اور چند شعر ملاحظہ ہوں:

مرغِ نواریز

آہ لذت کششِ غم، لٹ گیا دل آج کے روز  
 صبح ہے، نسائ سے زیادہ ہے پرندہ پُرسوز  
 درد، کوئل کی صدا میں، کبھی اتنا تو نہ تھا  
 شدتِ دردِ جگر، آج ہوئی صد سے سوا  
 کون ہے نغمہ سرا  
 جیسے کوئل کی صدا  
 آخرش راز ہے کیا  
 تارِ اشکوں کا بندھا

آہ، ڈوبا ہوا دل بحیرِ خوشی میں مرا  
 سوچتی تھی یہ مری کس نے اجاڑی دنیا  
 صبح دم، پھلٹے ہی پو، ہیرا کلیجہ کبھی پھٹا  
 تیرا اک آکے ترازو دلِ محزون میں ہوا  
 ایک بیک چیخ اٹھا  
 بھید کچھ کبھی نہ کھلا  
 کس کی آئی یہ ندا  
 تن بدن کانپ گیا

شور، وہ بھی غم و تاثیر کا حامل اتنا  
 تجھ کو کوئل کہ نقیبِ غم ہستی کہیے  
 کیا خوش آئند ترانہ، تجھے آتا ہی نہیں؟  
 دکھ بھری تان بدن، نغمہِ راحت بن جا  
 اف اماں، باخدا!  
 دل میں ہے حشرِ بیا  
 کچھ تو کہہ، بات ہے کیا؟  
 چھوڑ یہ طرزِ نوا

رہے شاعر سے ترا رشتہ جاں بخش روا  
 آئے کانوں میں کسی سمت سے جب تیری صدا  
 واہ لذت کششِ غم شاد ہے دل آج کے روز  
 سازِ محقق کے لیے وقف ہے، کوئل! ترا سوز  
 تجھ سے رنگیں ہو فضا  
 اس کا مفہوم ہو کیا  
 طاہرِ نغمہ سرا  
 اجر دے تجھ کو خدا

راہِ طلب میں جب ہو عزمِ سفرِ مکمل  
 اس دل کو کس کی یاد نے دیوانہ کر دیا  
 خود انتظار منزل کرتی ہے کارواں کا  
 کس شمعِ ہمیشہ سال کا پروانہ کر دیا  
 میرے لیے حیات میں، کتنا جہان تنگ ہے  
 کوئی بھی ہمنشین نہیں، کوئی بھی ہمنوا نہیں  
 مری زلیست غمزہ ہے، مرا قلبِ روربا ہے  
 یہی ہے مرافسانہ، یہی ہے مرا ترانہ  
 کوئی مجھ اسیر و تنہا کے نصیب پر نہ روئے  
 ہے نفس کبھی اک ٹھکانا، نہ رہا جب آشیانہ  
 شام ہی سے بکھرتا مشکِ فتن آتی رہی  
 خواب میں جس شبِ دہ زلفِ پرشکن آتی رہی

ہر نفس پر عشتو میں ہوتا رہا، اک امتحان  
 ہر قدم پر منزل دار و رسن آتی رہی  
 ادائے حق و فایں نہ کی کمی میں نے  
 یہ جان جس کی امانت تھی، اس کو دی میں نے  
 دیا جہان کو اک درس زندگی میں نے  
 نہ غم کو غم، نہ خوشی کو کہا خوشی میں نے  
 قرار کیا، مجھے دنیا میں موت بھی نہ ملی  
 نہ جانے، کیسے گزاری ہے زندگی میں نے  
 محفی خستہ حال کی تو نے جو بات پوچھولی  
 شاد تجھے خدا کرے، مقصد دل عطا کرے



## تمت اعماوی مجیبی پھلواری، سید حیات الحق محمد محی الدین

تمت اعوام تین تین برگزیدہ علم و فضل اور مستند نشین رشد و ہدایت خاندانوں کے نام  
 یواختے۔ چھٹی پشت اوپر دادھیال میں تاج العارفین حضرت مخدوم شاہ  
 مجیب اللہ قادری (ف ۱۱۹۹ھ / ۱۸۷۷ء) ان کے جدِ اعلیٰ تھے۔ تمتا کے دادا  
 (مولانا سفیر الحق عمادی) کے دادا نور الحق تپاں (ف ۱۲۳۳ھ) کی شادی جناب غلام  
 نقشبند سجاد بن حضرت خواجہ عماد الدین رح قلندر بادشاہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔  
 اور ان کے دادا شاہ سفیر الحق (ف ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء) کے عقد نکاح میں قاضی  
 مخدوم عالم کی صاحبزادی تھیں؛ اور خود قاضی مخدوم عالم کے حوالہ عقد میں حضرت  
 شاہ مجیب اللہ قادری رح کی پرپوتی تھیں۔ اسی لیے وہ اپنے نام کے ساتھ عمادی  
 اور مجیبی کی نسبتیں لکھا کرتے تھے۔

تمتا کے والد شاہ نذیر الحق شرب بیک شنبہ ۲۷ صفر ۱۲۵۹ھ (۲۶ مارچ ۱۸۴۳ء) کو  
 پھلواری شریف (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ "چراغ مجیب" سے تاریخ ولادت (۱۲۵۹)  
 نکلتی ہے۔ چونکہ گھر میں موروثی زمینداری تھی، اس لیے کسب معاش کی فکر سے  
 آزاد تھے؛ ساری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔  
 ان کا ۳ محرم ۱۳۲۳ھ (۱۰ مارچ ۱۹۰۵ء) کو پھلواری میں انتقال ہوا؛ نعل بیاباں  
 کی درگاہ میں حضرت غلام نقشبند سجاد کے مزار کے جوار میں مدفون ہیں۔ شعر بھی کہتے  
 تھے؛ فائز تخلص تھا۔ کلام کا مجموعہ (دیوان فائز) ڈاکٹر خواجہ افضل امام (شعبہ فارسی،  
 پٹنہ یونیورسٹی) نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ (پٹنہ ۱۹۶۷ء)

شاہ نذیر الحق فائز نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سر بہارا (تھکانہ خفر سرائے، ضلع گیا) کی تھیں۔ ان سے دو بیٹیاں ہوئیں۔ بڑی، شادی کے بعد لا اولد فوت ہوئیں؛ چھوٹی کی اولاد موجود ہے۔ ان کی دوسری بیوی مبارک۔ فاطمہ پھلواری شریف کے شاہ نور احمد نور کی صاحبزادی تھیں۔ نور خود بھی حضرت تاج العارفین شاہ مجیب اللہ قادری رح کے پر پوتے تھے۔ اس سبب کے لطف سے فائز کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھے۔ یہی صاحبزادے تمنا عمادی کے نام سے دنیا کے علم و ادب میں مشہور ہوئے۔

تمنا ۳ شوال ۱۳۰۵ھ (۱۷ جون ۱۸۸۸ء) کو پھلواری شریف میں پیدا ہوئے تھے۔ فیروز نجات سے تاریخ نکلتی ہے۔

والدین نے ان کا نام حیات الحق رکھا تھا، اگرچہ وہ مشہور اپنے ناکھیا لی نام محمد محی الدین سے ہوئے۔ انھوں نے خود اپنے نام کا سبب کہا تھا، جس میں یہ دونوں نام تخلص سمیت موجود ہیں:

غلام از غلامان محمد محی الدین حیات الحق تمنا

درس نظامی کی تکمیل اپنے والد حضرت نذیر الحق سے کی، گویا عربی اور فارسی میں منتہی تھے؛ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً مدرسہ حنیفیہ، پٹنہ میں ملازمت کی۔ یہ مدرسہ محمدی جان سبگم نواب یوسف حسین خان کا قائم کردہ تھا؛ اسی لیے بعض لوگ اسے مدرسہ محمدی جان بھی کہتے تھے۔ یہاں وہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۸ء تک عربی اور فارسی کے مدرس رہے۔ اس کے بعد وہ تقریباً ساڑھے تین سال سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے قائم کردہ ودیا پیٹھ (بہار) میں عربی فارسی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں یہاں سے الگ ہوئے، تو پھر کسی ادارے کی ملازمت نہیں کی۔ اس کے بعد پٹنہ کے بعض مسلمان وکلا ان سے قرآن پڑھنے لگے۔ یہ لوگ کچھ مالی خدمت بھی کر دیتے تھے۔ سر فخر الدین (ف ۱۹۳۳) فقہی معاملات میں بھی ان سے مشورہ کرتے رہے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو یہ عبدالعزیز

بیسٹراف (۶۱۹۴۸) وزیر تعلیم بہار کے مشیر خاص اور دستِ راست بن گئے۔ عبدالعزیز صاحب بعد کو صدر امور مذہبی بن کر حیدرآباد (دکن) گئے، تو تمنا کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ریاستِ نظام سے ان کا بھی مور و پے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ یہ انھیں انصام حیدرآباد (۶۱۹۴۸) تک باقاعدگی سے ملتا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں وہ اپنے اہل و عیال سمیت ہجرت کر کے ڈھا کے چلے گئے۔ اپنا کتابخانہ بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں حکومتِ پاکستان نے انھیں رہنے کو ایک وسیع مکان دے دیا تھا۔ علمی حلقوں میں بھی خاصی آؤ بھگت ہوئی۔ وہ مدتوں ڈھا کے ریڈیو سے قرآن کا درس نشر کرتے رہے۔ غرض یہاں معاش کے پہلو سے کوئی تشویش نہیں رہی، بلکہ خاصے خوش حال اور فارغ البال تھے۔ کسی سال بعد انھوں نے ڈھا کے سے نقل مکان کر کے چانگام میں اقامت اختیار کر لی، جہاں ان کے صاحبزادے محمد انعام الدین کا ٹھکے کا کاروبار تھا۔

ان کی بعض تصانیف مدت سے ناممکن پڑی تھیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ ان کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں کہ کراچی میں قیام اختیار کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور رفتہ رفتہ بینائی نے جواب دے دیا تھا؛ اس پر آپریشن کی ضرورت تھی۔ اس لیے کراچی چلے گئے اور ایک عزیز کے وہاں قیام کیا۔ اس اثنا میں ان کے بیٹے محمد انعام الدین نے بھی اپنا کام کاج کراچی منتقل کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء کے اواخر میں تمنا عادی ان کے پاس اٹھ گئے۔

آنکھ پر عملِ جراحی ہوا اور بینائی بحال ہو گئی۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۹۷۲ء کے شروع میں حلق کے کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ علاج معالجہ بیسودہ تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ کھانا پینا بالکل ترک ہو گیا۔ کیونکہ کوئی چیز حلق سے نیچے اترتی ہی نہیں تھی۔ سیال چیزوں میں سے دو چار گھونٹ سخی، یا آدھی پیالی چائے، ان کی دن بھر کی خوراک رہ گئی تھی، یہ عمر اور اتنی مختصر خوراک! اسی میں ۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء (۲۰ شوال ۱۳۹۲ھ) راہی ملک بقا ہو گئے۔

انہوں نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی شادی اپنے ہی خاندان میں علی محی الدین پھلواروی کی صاحبزادی سے ہوئی؛ یہ ان کی سگی خالہ کی بیٹی تھیں۔ ان کے لطن سے ایک بیٹا (محمد امام الدین فائق) اور ایک بیٹی (ولیمہ) پیدا ہوئے۔ محمد امام الدین نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق عربی توپڑ سنا ہی تھی، اس کے علاوہ کچھ انگریزی بھی پڑھی۔ لیکن ان کے دماغ میں کچھ خلل پیدا ہو گیا۔ وہ یکایک کہیں غائب ہو گئے اور باوجود تلاش بسیار پھر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

دوسرا نکاح برانواں (ضلع گیا) کے حانظ شاہ بلاقی کی صاحبزادی عزیز الفاطمہ کے ساتھ ہوا۔ ان کے لطن سے ایک بیٹا محمد انعام الدین اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بحمدہ یہ سب موجود ہیں۔ محمد انعام الدین چائے نگام میں انجینئر تھے۔ لیکن معلوم نہیں کیا جی میں آئی کہ ملازمت سے مستعفی ہو کر ٹھیکے داری کرنے لگے؛ کراچی میں مقیم ہیں۔

ہندستان سے جہانے کے بعد انہوں نے ایک نکاح (تیسرا) مشرقی بنگال میں سبھی کیا تھا۔ ان سبک سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ بھی ان کے ساتھ کراچی چلی گئی تھیں اور ان کا تمنا سے چند ماہ قبل وہیں ۱۹۷۲ء میں انتقال ہوا۔

علم و فضل اور شعر گوئی تمنا کو گویا ورثے میں ملی تھی۔ وہ اردو، فارسی اور عربی، تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ زبان و بیان اور عروض میں مہارت تا تادم تھی، جو انہوں نے اپنے والد سے سیکھے تھے۔ اسلامی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، ہر ایک میں اجتہادی نقطہ نظر رکھا اور ان کی بیشتر تصانیف انہی علوم سے متعلق ہیں۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ مدتوں وظائف و اواراد کے پابند رہے، بلکہ ناخفیاں سلسلے میں خود حضرت مخدوم منہاج الدین جیلانی کے سجادہ نشین بن سکتے تھے؛ لیکن قرآن کے غائر مطالعے کے بعد انہوں نے ان سب چیزوں سے کنارہ کر لیا، اور انہیں بدعت سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح انساب اور رجال اور تاریخ اسلام میں بھی ان کا مطالعہ اور واقفیت



غیر معمولی اور حیرتناک تھی۔

اردو کلام پر عبدالاحد شمشاد لکھنوی (ف ۱۹۱۷ء) سے اصلاح لی۔ فارسی اور عربی میں مولانا شبلی نعمانی (ف نومبر ۱۹۱۴ء) سے مشورہ کیا۔ شبلی کے تلمذ کا قصہ بروایت مولانا سید محمد جعفر پھلواری بہت دلچسپ ہے۔

تمنا کے والد فارسی کے فاضل اور شاعر تھے۔ اسی سے انھیں کبھی فارسی میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ بہت محنت سے کچھ غزلیں کہیں اور اصلاح کے لیے شبلی کی خدمت روانہ کیں۔ شبلی نے اس خط کے ساتھ انھیں واپس کر دیا:

جس زبان میں آپ نے اشعار نظم کیے ہیں، وہ فارسی نہیں ہے، بلکہ اردو کا فارسی میں لفظی ترجمہ ہے۔ سے کی جگہ از، میں کی جگہ در، اور آیا کی جگہ آمد لکھ دینے سے فارسی نہیں ہو جاتی۔ اگر آپ فارسی میں شعر کہنا ہی چاہتے ہیں، تو کم از کم تیس برس تک اساتذہ کا کلام بغور دیکھیے، اور پھر غزل کہہ کر بھیجیے؛ شاید قابل اصلاح ہو۔ لیکن شروع میں سعدی اور حافظ کا کلام قطعی نہ پڑھیے، بلکہ اپنے مطالعہ کو نظیری اور حزیں تک محدود رکھیے۔

اس خط سے مایوس تو ہوئے، لیکن بجز وصلہ نہیں ہوئے اور فارسی کے مطالعے پر جٹ گئے۔ نظیری کی رنگینی پر کشش تھی، اس لیے اسے خوب پڑھا، حزیں خشک اور ثقیل تھا، اس لیے اس سے اجتناب کیا۔ چھ ماہ بعد پھر غزل بھیجی، اور لکھا کہ میرا مطالعہ نظیری تک محدود رہا ہے، حزیں سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں کر سکا جو اب میں شبلی نے صرف ایک سفر لکھی:

حزیں کے کلام کی طرف طبیعت کا راغب نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی آپ کو فارسی نہیں آئی۔

یہ بھی دُھن کے پکتے تھے؛ نظیری کو چھوڑ کر حزیں کے لیے وقف ہو گئے۔ بتدریج وہ اسے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔ مزید یہ کہ روزانہ مختلف



طرحوں میں کچھ شعر کہتے، خود ہی اس پر غور کرتے اور ضائع کر دیتے۔ سال بھر بعد پھر غزل شبلی کی خدمت میں بھیجی۔ جواب آیا:

آپ کی ترقی کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ برسوں کا ریاغض آپ نے مہینوں میں کیا ہے۔ مختصر یہ کہ اُس وقت آپ کی غزل قابل توجہ نہ تھی اور اب محتاج اصلاح نہیں۔

غرض یہ سلسلہ دو برس تک جاری رہا۔ انہیں خود اعتراف تھا کہ میری عربی اور فارسی کی نظم و نثر جو کچھ بھی ہے، یہ تمام و کمال مولانا شبلی کی مرہونِ منت ہے۔

ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے؛ ان میں زیادہ تعداد مذہبی موضوعات کی ہے۔ جتنا ان کی زندگی میں چھپ سکا، کم از کم اس کے برابر مسودات کی شکل میں غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ ان کا بیشتر حصہ مولانا سید محمد جعفر پھلواری (لاہور) کی تحویل میں ہے۔

اردو علم و ادب کے شائقین کی دلچسپی کی کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: ثنوی مذہب و عقل، ثنوی معاش و معاد، ایضاحِ سخن (شوقِ سندیلوی کی کتاب اصلاحِ سخن کی دس شعر کی پہلی غزل پر اساتذہ وقت کی اصلاحوں کا جائزہ)، رسالہ تذکیر و تانیث، افعالِ مرکبہ۔ ان کا نام ایک اور سلسلہ میں بھی یادگار رہیگا۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ انہوں نے خالقِ عماد یہ منگل تالاب، پٹنہ کے کتابخانے کے پرانے مسودات میں سے دینی موضوع پر ایک مختصر رسالہ ڈھونڈ نکالا، جو اردو نثر میں ہے۔ تمنا کا دعویٰ تھا کہ یہ حضرت عماد الدین قلندر پھلواری کی تصنیف ہے۔

اس کا نام ”سیدھا راستہ“ (صراطِ مستقیم) تھا اور اس پر تاریخ ۲۲ ربیع الاول ۱۰۸۱ کی ثبت تھی۔ اگر یہ دعویٰ درست تسلیم کر لیا جائے، تو نہ صرف اس سے پرانی کوئی نثری تحریر اب تک بہار میں دستیاب نہیں ہوئی، بلکہ یہ پورے شمالی ہند کی سب سے پرانی نثر ہے، کربل کھٹا سے بھی قدیمتر، جس کی پہلی روایت ۱۱۲۵ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ لیکن بعض حلقوں کی طرف سے اس کی صحت پر شبہ وارد کیا

گیا ہے۔

ملک کے مختلف حصوں میں ان کے شاگردوں کی کافی تعداد ہے۔ پروفیسر مختار الدین احمد (صدر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے کسی زمانے میں شاعری کی ہے؛ وہ آرزو تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے بھی تمنا سے اصلاح لی ہے۔

انسوس، کہ ان کے اردو یا فارسی کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا، حال آں کہ ضمیمہ کلیات کے برابر ذخیرہ ہوگا۔ چند غزلیں بڑی مشکل سے دستیاب ہوئیں؛ انہیں کا انتخاب درج ذیل ہے۔ زبان پر قدرت، محاورے اور روزمرے میں استادانہ نگاہ، عروض کی ماہرانہ واقفیت ایک ایک مصرعے سے عیاں ہے۔

تم تمنا سے کیوں نہیں ملتے      آدمی ہے بڑی مروت کا  
گلشن میں دہے پانوں، صبا! بچ کے نکلنا      مرقد میں تمنا کی ابھی آنکھ لگی ہے  
جو گیا، شباب! تو ہی، تو گئیں وہ ساری باتیں      نہ وہ عشرتوں کے دن ہیں، نہ وہ راحتوں کی باتیں  
تجھے میں بھلا دوں، لیکن کمی بھول سکتی بھی ہیں      تیری بھولی بھالی صورت، تیری میٹھی میٹھی باتیں  
کوئی توڑنے کی شے ہے، شبِ وصل کا تصور      وہ مزے مزے کی چہلیں، وہ مزے مزے کی باتیں  
زرگس سی آنکھ، سر و ساق، برگ گل سے لب      گلشن میں آج کون سراپا چمن گیا

رخ و زلف و ابرو و چشم و لب۔ کہو، کس کی کس کی ہے کوئی  
ہیں ادھر تو دشمن جاں سبھی، اگر ایک ہو، تو کہے کوئی  
وہ ملے کسی کو بھی آج تک کہ ملیں گے حضرت! دل! تمہیں  
فقط آرزو ہی میں رات دن جو رہے کوئی، تو رہے کوئی  
میری سرگزشت ہے گفتنی، مرا ماجرا ہے شنیدنی  
نہیں سنتے وہ، تو کہوں میں کیا؛ جو سنے کوئی، تو کہے کوئی  
یہ ہزار طرح کی گالیاں، وہ بھی دشمنوں کی زبان سے  
کہے جو بھی چاہے، بُرا بھلا، مگر اپنے منہ سے کہے کوئی

مراقتل جسم وفا پہ ہے، میں ہوں اپنے جرم کا معترف  
جو سزا ہو، میری ہی ہو سزا، مگر ان کو کچھ نہ کہے کوئی  
نہیں چشم و گوش یہ کام کے، رہے عقل و ہوش تو نام کے  
جو سہے مصیبتِ زندگی تو اب اس قدر نہ سہے کوئی  
لگے کہنے آج یہ دیکھ کر کہ تمنا ان کی گلی میں ہے  
یہ زرا پسند نہیں مجھے کہ مری گلی میں رہے کوئی

وہ فتنہ جو نقاب تو رخ سے جدا کرے  
یہ بزم غیر سہی، اک زرا نظر تو ملے  
میں ملیں نہ ملیں ہے یہاں تلاش کی دھن  
ساتھی! گھٹا ہے صحنِ چمن ہے، بہار ہے  
نکلین جس نے ہاتھ سے کھوئی، وہ خوار ہے  
لب بند اور وقت ہے عرضِ نیاز کا  
نغموں سے شوقِ دید کے تارِ نظر ہیں مست  
اک لقیں بالاسر اپنا ہر گماں بنتا گیا  
ہم گرے کتنی جگہ راہِ طلب میں سر کے بل  
زنگ اڑا، آنکھیں چڑھیں، پلکیں گریں، بچکی بندھی  
راہِ آزادی تو خود ہوتی ہے رہرو آفریں

مجھ کو تمنا! یاد ہے سجدہ پہ سجدہ پئے بہ پئے  
ہاے تم اور یہ شغلِ مے! کوئی سنے تو کیا کہے؟

## سید احتشام حسین رضوی، پروفیسر

جوہنپور اور فیض آباد کے درمیان (اعظم گڑھ لائن کے قریب) ایک مختصر قصبہ سما گا نو "ماہل" نامی ہے۔ یہاں سادات رضوی کی آبادی بہت پرانی ہے۔ انہیں میں ایک صاحب سید ابو جعفر رضوی ہوئے ہیں۔ وہ بڑے باہمت اور ذہین شخص تھے۔ اگرچہ گھر کی کچھ اوسط درجے کی زمینداری تھی، لیکن اب اس سے آمدنی اتنی نہیں رہی تھی کہ گھر کے اُجیلے خرچ کی کفیل ہو سکے۔ لہذا انہوں نے اس میں اضافہ کرنے کو ملازمت کا پیشہ اختیار کر لیا؛ اور واقعاً بیشتر یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ جب ۱۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو ان کا انتقال ہوا ہے، تو سن ۲۵-۲۶ برس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ ان کی وفات بہت افسوسناک حالات میں ہوئی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں سید ابو جعفر کسی کام سے کلکتے گئے، تو سیر کرانے کے لیے اپنے بڑے بیٹے احتشام حسین کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ سیر سپاٹا ختم کرنے کے بعد واپسی ہوئی، تو ریل کے جس ڈبے میں یہ دونوں سوار تھے، اسی میں چیچک کے مرض میں مبتلا ایک اور مسافر ان کا ہم سفر تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس پر مرض کا زبردست حملہ ہو چکا تھا، اور وہ متواتر ترقے کر رہا تھا۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن اس سے سفر کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ آخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔ گھر پہنچتے ہی دونوں باپ بیٹے چیچک کی گرفت میں آ گئے۔ مرض اتنا شدید تھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ سید ابو جعفر تو بالآخر اسی میں چل بسے، لیکن احتشام حسین کچھ دن کی روادوشی کے صدقے پچ نکلے۔ جن لوگوں نے انہیں بعد کے زمانے میں



دیکھا ہے، انھیں معلوم ہو گا کہ ان کا منہ چپک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا؛ یہ اسی حادثے کی یادگار تھے۔

ابو جعفر نے اپنے پیچھے اولاد میں چار بیٹے (احتشام حسین، وجاہت حسین، انصار حسین، اقتدار حسین) اور ایک بیٹی جمپوٹری۔ ان میں سید احتشام حسین سب سے بڑے تھے؛ ان کا والدہ کا نام زاہد النساء بیگم تھا؛ بفضلہ تعالیٰ یہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

اگرچہ سرکاری کاغذات میں سید احتشام حسین کی تاریخ ولادت ۱۲ جولائی ۱۹۱۲ء درج ہے، لیکن وہ درحقیقت ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو ماہل سے آٹھ میل دور اٹرڈیہ گاؤں میں پیدا ہوئے، جیسا کہ انھوں نے ایک مرتبہ میرے دریافت کرنے پر بتایا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں ماہل میں پلیگ کا دور دورہ تھا، اس لیے خاندان کا ان کے پھوپھا سید محمد قاسم حسین کے وہاں قیام تھا۔ ابتدائی تعلیم ماہل کے مڈل اسکول میں پائی۔ اس کے بعد اعظم گڑھ پہنچے اور یہاں کی قدیم آسٹریلیائی مشنری درسگاہ، ویزلی ہائی اسکول سے ۱۹۳۰ء میں دسویں درجے کی سند درجہ اول میں اس امتیاز سے حاصل کی کہ ان کا نام اسکول کی اعزازی فہرست کے تختے پر لکھا گیا۔ یہ نام آج بھی وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس دوران میں والد کا انتقال ہو چکا تھا اور گھر کے حالات اب مزید تعلیم جاری رکھنے کے لیے سازگار نہیں رہے تھے۔ چچا حکیم سید ابو محمد عیش نے بساط بھر مدد کی، لیکن وہ بھی پورا بار اٹھانے سے معذور تھے۔ بھلا عزم محکم اور یقین کامل کے رستے میں کوئی شے کبھی حائل ہو سکی ہے! اگرچہ یہ زمانہ مسلسل کشمکش اور جدوجہد کا تھا، لیکن نوجوان احتشام حسین ہمت نہیں ہارے۔ خوش قسمتی سے ان کے پھوپھا سید محمد قاسم حسین بسلسلہ ملازمت الہ آباد میں مقیم تھے؛ وہ کوئٹوال شہر کے پیشکار تھے۔ انھوں نے اپنے پاس بلا لیا اور مقامی گورنمنٹ انٹر کالج میں داخل کرادیا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کا تبادلہ باہر ہو گیا، تو احتشام صاحب سید لخت حسین (والد مصطفیٰ زیدی) کے مکان پر اٹھ گئے۔ سال بھر ان کے



ساتھ قیام رہا۔ ۱۹۳۲ء میں انٹر کے بعد بی اے میں داخلہ لیا تھا کہ کسی طرح ڈاکٹر سید اعجاز حسین صدیقی اردو الہ آباد یونیورسٹی (ف فروری ۱۹۷۵ء) تک ان کی خبر پہنچی۔ انھوں نے اے کے رہنے کو اپنے مکان میں ایک کمرہ دے دیا۔ ۱۹۳۲ء میں بی اے کا امتحان درجہ اول میں امتیاز سے پاس کرنے پر ایم اے میں تمنا اور وظیفہ ملا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں یہیں سے ایم اے (اردو) کا امتحان اس امتیاز سے پاس کیا کہ پوری یونیورسٹی میں اول آئے؛ درجہ اول حاصل کیا اور آرٹ فیکلٹی کے بہترین طالب علم قرار پانے پر سونے کا تمغہ ملا۔

اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ کے شعبہ اردو میں مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ ۱۲۵ روپے مشاہرہ ملنے لگا۔ اور بارے، قدرے عاقبت کی سانس لینا نصیب ہوئی۔

لکھنؤ سے ۲۷ میل دور نگرام نام کا ایک اچھا مشہور قصبہ ہے۔ یہاں ایک وکیل میر فدا حسین ہوئے ہیں۔ وہ اپنے پیشے میں بہت کامیاب رہے اور انھوں نے بڑی جاداد پیدائی تھی، حتیٰ کہ وہ ساڑھے چھ ہزار سالانہ کے مالگزار بن گئے۔ ان کے کسی اولاد میں تھیں۔ ان میں منجھلے بیٹے کا نام میر حسن عسکری تھا، جن کے دو بیٹیاں ہوئیں، بڑی کا نام کاظمی بانو تھا اور چھوٹی کا ہاشمی بانو۔ ان دونوں کی ایک ہی دن ۳۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو شادی ہوئی؛ بڑی شمیم کرہانی (ف مارچ ۱۹۷۵ء) کے عقد نکاح میں آئیں، اور چھوٹی سید احتشام حسین کے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منشی پریم چند (ف اکتوبر ۱۹۳۶ء) کی زیر صدارت لکھنؤ میں ہوئی۔ سید احتشام حسین اس تحریک کے آغاز ہی میں اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ان کا مکان (محلہ بارود خانہ، گولہ گنج) ترقی پسندوں کی سرگرمیوں کا خصوصاً، اور دوسرے ادیبوں کا عموماً مرکز بنا رہا۔ یہاں ہر اتوار کی شام انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ ہوتا؛ نظم و نثر کی تخلیقات پیش ہوتیں اور ان پر بحث و تمحیص ہوتی۔ یہ جلسے

تقسیم ملک تک جاری رہے۔ ان سے جہاں رفتہ رفتہ نوجوان لکھنے والوں کا مستعد گروہ تیار ہو گیا، وہیں خود سید احتشام حسین کو بھی اس سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ ان کا ذاتی مطالعہ بہت گونا گوں تھا۔ وہ بہت تیز پڑھنے والے تھے؛ ضخیم سے ضخیم کتاب دو چار دن میں دیکھ جاتے۔ حافظہ بہت اچھا پایا تھا، جو پڑھتے، اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ رہ جاتا۔ انھیں اردو انگریزی کے علاوہ ہندی میں بھی پوری مہارت حاصل تھی۔ تاریخ اور فلسفہ اور ادب ان کے خاص موضوع تھے۔ اردو کا پورا سرمایہ تو انھیں دیکھنا ہی تھا کہ اس کا پڑھنا ان کے فرض منصبی میں داخل تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی کے واسطے سے عالمی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، اور وہ مغربی ادب کی تحریکوں سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ ان ہفتہ واری ادبی جلسوں میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں بیدار ہوئیں، انھیں مختلف موضوعات پر فی البدیہہ تقریر کرنے اور بحث مباحثے میں حصہ لینے کی مشق ہوئی، اور یوں انھیں اپنے مطالعے کے نتائج کو نظریات اور اصولوں میں ڈھالنے کا موقع بھی ملا۔ بتدریج وہ ہماری زبان کے سربراہ اور نقاد اور ادیب تسلیم کر لیے گئے۔ غرض ان کا یہ لکھنؤ کا قیام ان کی شخصیت اور کردار کی تشکیل اور ارتقاء کے لحاظ سے بچہ اہم زمانہ ہے۔

سید احتشام حسین اگرچہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن نہیں رہے، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ وہ مارکسی نقطہ نظر کے ہمدرد تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں تہاں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ ادب اور زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف تھے۔ اسی لیے وہ روایت اور ماضی سے رشتہ منقطع کرنے کو بھی غلط سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان پر الگ الگ بحث کرنا نہ صرف مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ بسا اوقات یہ غلط نتائج تک پہنچا دیتا ہے۔

ادب اردو کے میدان میں ان کی حیثیت مسلمہ تھی۔ سب حلقوں میں ان کی رائے

وقت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ فروری ۱۹۵۲ء میں امریکا کے مشہور ادارے راک فیڈر فاؤنڈیشن نے انھیں پیشکش کی کہ وہ اس کے خرچ پر امریکا اور انگلستان ہو آئیں۔ بظاہر کوئی خاص منصوبہ مد نظر نہیں تھا؛ بس جائیں اور ان ملکوں کے مصنفوں، پروفیسروں، دانشوروں، ناشرین، سربراہوں اور وہ لوگوں سے ملیں؛ ان سے گفتگو کرنے کے بعد دیکھیں اور مشورہ دیں کہ ہندستان کی ادبی زندگی کی تنظیم اور یہاں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان کی تصنیفات کی اشاعت کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ احتشام حسین کی آرا اور سبلانات کسی سے مخفی نہیں تھے۔ اس لیے وہ متعجب تھے کہ امریکا سے یہ دعوت آنے کی لم کیا ہے؟ اسی لیے وہ اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن سب اعزہ واجباب نے اصرار کیا کہ ایسے موقعے روز روز نہیں ملتے، دعوت قبول کر لو۔ بالآخر بہت جھین بیٹھیں کے بعد انھوں نے یہ پیشکش منظور کر لی۔ وہ ستمبر ۱۹۵۲ء میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں پھرے، پروفیسروں سے ملے جلے، ان کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سربراہوں اور وہ لوگوں سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں وہ امریکا سے انگلستان چلے آئے۔ وہی پروگرام یہاں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج میں بھی رہا۔ اسی دوران میں چند دن کے لیے پیرس کا ایک چکر بھی کاٹ آئے۔ بالآخر نو دس مہینے کی غیر حاضری کے بعد جولائی ۱۹۵۳ء میں واپس وطن پہنچے۔ ان کی کتاب ”ساحل اور سمندر“ اسی سفر کی ڈائری ہے۔

معلوم نہیں، راک فیڈر فاؤنڈیشن نے جس مقصد سے انھیں امریکا جانے کی دعوت دی تھی، وہ پورا ہوا یا نہیں۔ لیکن اس سفر سے پروفیسر احتشام حسین کو یقیناً بہت فائدہ پہنچا۔ سیاحت اور مختلف ملکوں کا سفر ہر حال میں تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لیے سیاحوں کا فیاضی کا ارشاد خداوندی ہے۔ امریکا اور انگلستان میں انھیں وہاں کے اساتذہ ادب اور اساطین فکر و نظر سے ملنے اور ان سے تبادلہ خیالات کرنے کا

موقع ملا۔ سونا کسوٹی پر چڑھ کر کندن بن گیا۔

۱۹۶۱ء میں ان کے استاد ڈاکٹر اعجاز حسین شعبہ اردو والہ آباد یونیورسٹی کی صدارت سے سبکدوش ہوئے، تو ان کی جگہ اکھنڈ علی، اور وہ الہ آباد منتقل ہو گئے۔ اب ان کی شہرت کا آنتاب نصف النہار پر تھا۔ ملک کی کوئی اردو تحریک ان کے مشورے سے محروم نہیں تھی، وہ ہر جگہ تو لا اور فعلاً اس میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے تھے۔ ان یونیورسٹیوں میں جہاں اردو کا شعبہ تھا، پیشتر عزل و نصب میں ان کی رائے کا دخل تھا۔

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی بڑے جوش و خروش سے منائی گئی تھی، ہندستان میں اس سلسلے میں جو کچھ ہوا، وہ سب کے علم میں ہے۔ بیرونی ممالک میں سے روس نے اس بارے میں خاص اہتمام کیا اور ہندستان سے بھی کچھ لوگوں کو ان تقریبات میں شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ پانچ اصحاب کا ایک وفد روس گیا تھا۔ اس وفد کے لیڈر ڈاکٹر عبدالعلیم والنس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ف فروری ۱۹۷۰ء) تھے اور اراکین میں پروفیسر سید احتشام حسین، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری اور یہ فاکسار تھے۔ ہم لوگ ۱۴ مئی ۱۹۶۹ء کو یہاں سے روانہ ہوئے اور ۳۱ مئی ۱۹۶۹ء کو واپس آئے۔ ہم ازبکستان اور تاجکستان کے متعدد شہروں کے علاوہ موسکوا اور لینن گراڈ بھی گئے تھے۔ ان دو ہفتوں میں مجھے سید احتشام حسین کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ہر موقع پر اپنی ذہانت، حاضر جوابی، علم کی وسعت، اور خیالات کی پختگی کا ثبوت دیا۔ وہ ساتھ کے ساتھ اس سفر کا روزنامہ بھی لکھتے رہے تھے۔ نہ جانے، یہ آج تک شائع کیوں نہیں ہوا!

انہوں نے ۱۹۷۲ء میں ۶۰ برس پورے کر لیے تھے اور قاعدے کے مطابق عنقریب ملازمت سے سبکدوش ہونے والے تھے۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ اس کے بعد لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کریں گے۔ چنانچہ وہاں اپنے پرانے مسکن بارودخانہ کے نواحی احاطہ ممتاز حسین میں ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ لیکن تدبیر کند بندہ و تقدیر



کنندہ۔ ان کی صحت بالعموم بہت اچھی رہی تھی؛ معدے کی کبھی کبھی شکایت کرتے تھے۔ لیکن جمعہ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء صبح ساڑھے آٹھ بجے یک لخت دل کے درد کا شدید دورہ پڑا، اور اس سے پیشتر کہ طبی امداد پہنچ سکے، "آنا فاناً روح نفس عنصری سے پرواز کر گئی۔" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاٰجِعُوْنَ۔ جنازہ اگلے دن سینچر کو اٹھا کر بلا، الہ آباد میں آخری خواہگاہ نصیب ہوئی۔ نماز جنازہ سنی اور شیعہ حضرات نے الگ الگ پڑھی۔ ملک بھر میں جس وسیع پیمانے پر ان کا ماتم ہوا، وہ ان کی ہردلعزیزی اور مقبولیت پر دال ہے۔

متعدد اصحاب نے تاریخ وفات کہی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (لکھنؤ) نے حالی کے مرثیہ غالب کے ایک مصرعے: "رحلتِ فخر روزگار ہے آج" سے تاریخ نکالی؛ اس سے ۱۹۷۲ء برآمد ہوتے ہیں۔ پروفیسر سید حسن سرمد (شعبہ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) نے بھری میں قطعہ کہا؛ اس کی آخری بیت تاریخ ہے:

یہ ان کی موت کی سرمد نے ہے لکھی تاریخ

"جہاں کا فاجعہ ہے مرگِ احتشام حسین"

(۱۳۹۲ھ)

جسمانی یادگار میں چھ بچے چھوڑے، چار بیٹے؛ جعفر عباس (محمد میاں)؛ جعفر عسکری (عون میاں)؛ ارشد حسین (ارشاد میاں)؛ جعفر اقبال (اقبال میاں) اور دو بیٹیاں (سعیدہ اور ثریا)۔

ان کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب افسانوں کا مجموعہ ہے جو "ویرانے" کے نام سے شائع ہوا تھا (الہ آباد ۱۹۷۳ء) یہ دوسری مرتبہ ۱۹۷۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ تنقیدی جائزے (حیدرآباد ۱۹۷۴ء) یہ بعد کو الہ آباد سے ۱۹۷۵ء میں اور لکھنؤ سے ۱۹۵۱ء میں اور اس کے بعد کبھی چھپی؛ روایت اور بغاوت (حیدرآباد ۱۹۷۷ء نیز ۱۹۵۶ء)؛ ادب اور سماج (کبھی ۱۹۷۸ء)؛ تنقید اور عملی تنقید (دلی ۱۹۵۲ء)؛ ذوقِ ادب اور شعور (لکھنؤ ۱۹۵۵ء)؛ ساحل اور سمندر (لکھنؤ ۱۹۵۴ء)؛



اردو ساہتیہ کا اتھاس (ہندی میں) (علی گڑھ ۱۹۵۵ء) اسی کا دوسرا ایڈیشن "اردو ساہتیہ کا آج" کا عنوان ہے۔ ۱۹۷۰ء میں الہ آباد سے شائع ہوا، اس کا ترجمہ روسی زبان میں بھی ہوا ہے۔ عکس اور آئینے (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۷۲ء)؛ افکار و مسائل (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۷۳ء)؛ تنقیدی نظریات (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۷۰ء)؛ اعتبار نظر (لکھنؤ ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۵ء)؛ کلکی از رادھا کرشنن کا ترجمہ (دلی ۱۹۷۱ء)؛ دو یگانہ از رو میں ردال کا ترجمہ (دلی ۱۹۷۳ء)؛ گنجی کی کہانی از مورا سکی (دلی ۱۹۷۰ء)؛ انتخاب آب حیات (دلی ۱۹۷۲ء)

غیر مطبوعہ کتابوں میں جوش اور اس کا فن اور سفرنامہ روس زیادہ اہم ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ تاریخ ادب اور مرتب کر رہے تھے۔ افسوس کہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ بہر حال جتنا حصہ بھی لکھا گیا، اسے محفوظ کر دینا چاہیے۔

مرحوم شعر بھی کہتے تھے اور کبھی کبھی اجباب کے اصرار پر شاعرے میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ زندگی میں کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ وفات کے بعد یہ مختصر سرمایہ "روشنی کے درتچے" کے عنوان سے چھپا (الہ آباد ۱۹۷۳ء)۔

آخری زمانے میں انھوں نے ایک قلمی نام: "اح نورا زل" اختیار کر لیا تھا اور اس کے تحت نظمیں لکھا کرتے تھے۔ معلوم نہیں ہوسکا کہ کیا بات یہ نام اختیار کرنے کی محرک ہوئی۔ وہ نظمیں اس سے پہلے بھی لکھتے رہے تھے، اور یہ قلمی نقاب اوڑھنے کے بعد جو منظومات انھوں نے پیش کیں، ان میں پہلے کلام سے کوئی ماہہ الامتیاز خاص بات بھی نہیں ہے۔ ان کا عنوان انھوں نے "آوازیں" رکھا تھا؛ یہ بھی اسی مجموعے (روشنی کے درتچے) میں شامل ہیں۔

اب نمونے کے چند شعر دیکھیے:

مت سمجھ آسودہ ساحل ہیں، اے ہمنشین!

آپڑا جب وقت طوفانوں سے ہم ٹکرا گئے

بستیاں ہوتی گئیں برباد، ویرانے بڑھے  
ہم یونہی منزل بہ منزل جانبِ صحرا گئے  
اک ادھورا خواب بن کر رہ گئی ہے زندگی  
اے خیالِ دوست! اب تجھ سے بھی ہم گھبرا گئے

تو تو خاموش رہا، لیکن سن لیا شوق نے جواب ترا  
گرچہ آغازِ محبت نے دیے ہیں دھوکے لیے جاتی ہے کہیں کاوشِ انجام مجھے  
کچھ ایسی ہی گذری ہے کہ خوں ہو گیا دل بھی  
آنکھوں کو لہور و نونے کا ارمان تو نہیں ہے  
روشن نہ سہی صبحِ وطن، اے دلِ پر شوق  
بیرونِ نقیِ شامِ غریباں تو نہیں ہے

کیا دلپذیر صبح تھی، کیا دلنواز شام! جاتے ہی ان کے رونقِ شام و سحر گئی

نگاہِ دوست باندازِ اتفادات ملی اب اور چاہیے کیا، دولتِ جیالی  
مری وفا کو تغافل کا ہو گیا دھوکا اس احتیاط سے وہ چشمِ اتفادات ملی

کبھی کبھی تو تری یاد میں ملا وہ سکوں کہ دردِ ہجر پہ ہم اعتبار کرنے کے

جیسے کہیں سے دولت کو نین مل گئی کیسا حسین وعدہ بے اعتبار ہے

اک گردشِ دوام ہے ذروں کی زندگی کیسا کھلا فریبِ خیالِ تسرار ہے

عادت سی ہو گئی ہے، وگرنہ تراقسرار تھا اعتبار پہلے، نہ اب اعتبار ہے

کیوں کر کہوں کہ قربِ ترا بے اثر رہا لیکن غمِ فراق کی لذت ہی اور ہے

ظاہر نہ کر سکا میں اسے اشکِ واہ سے اے دوست میرے غم کی حقیقت ہی اور ہے

جب سے غم کا ہوا ہوں رمز شناس یاں کرتی ہے بتیزار، نہ آس

کل تو خیر، ان کی یاد آئی تھی آج کیوں سے، فضا اداس اداں!

حسنِ نازاں ہے جس تغافل پر عشق کو سبھی وہ بات آتی ہے

کوئی تو بات تھی اہل جنوں کے تیور میں اٹھی ہیں سب کی نگاہیں جہاں سے گزرے ہیں

یقین کی منزل پر خارت تک پہنچنے میں ہزار محشر و دم و گناہ سے گزرے ہیں  
 ندیم! پوچھو نہ اس وقت کیفِ سرشاری  
 دیارِ کاکلِ عنبر نشاں سے گزرے ہیں  
 اے دوست! میکرے میں یہ کیسی ہوا چلی  
 سب فتنہ ہائے دیر و حرم یاد آگئے  
 ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے ہیں خرد کے بت  
 بتخانہ جنوں کے صنم یاد آگئے  
 بچا کے سب کی نظر، جس سے دیکھتے ہو مجھے  
 ہزار طرح کی لذت اس اک نگاہ میں ہے

ہ شفتگی بڑھے، تو بڑھے؛ لیکن اے ندیم! ہوساری رات زلفِ شکن درکن کی بات  
 تلاشِ نور میں ظلمت بھی کام آتی ہے  
 خزاں کی گود میں نخل بہا رہتے ہیں  
 تری نگاہ جگاتی ہے شوق کا جادو  
 جواک چراغ بجھے، سو چراغ جلتے ہیں  
 ناموس و فاقی پاسبانی  
 لے جاؤں کہاں یہ چشم پر نم!

رسم ہی شہرِ تمنا سے وفا کی اکٹھا جائے  
 اس طرح تو نہ کوئی اہل محبت کو ستائے  
 اپنی ذلت کی صلیب آپ لیے پھرتا ہوں  
 یہ بڑا بوجھ، محبت کے سوا کون اٹھائے!  
 تجھے پسند جو دل کی لگن نہیں آئی  
 مجھے بھی راس تری انجن نہیں آئی

کچھ مرے شوق نے درپردہ کہا ہو جیسے  
 آج تم اور ہی تصویرِ حیا ہو جیسے  
 یوں گذرتا ہے تری یاد کی وادی میں خیال  
 خارزاروں میں کوئی برسہہ پا ہو جیسے

یقینِ عشرتِ فردا نہیں، تو کچھ بھی نہیں  
 نظر میں صبح کا جلوہ نہیں، تو کچھ بھی نہیں  
 نہ دردِ زلیست، نہ حسنِ نظر، نہ ذوقِ جمال  
 جنوں کے بھی نہ ہوئے کچھ، خرد سے بیگانے  
 رکھیں سلا دو، پلا کر شرابِ کم نظری  
 کہ سنگ و خشت سے رکتے نہیں یہ دیوانے

جب ترا غم بھی ساتھ دیکھ نہ سکا  
 مجھ پہ گذری ہیں ایسی راتیں بھی  
 دل تری یاد میں ہر لمحہ تڑپتا بھی نہیں  
 بند ہو جائے تڑپنا، یہ گوارا بھی نہیں

وہ نہیں پاس، تو احساسِ رفاقت ہے سوا  
 کر تو لیں ترکِ تمنا کا ارادہ، لیکن  
 جب تم نہیں تو زہر میں دنیا کی لذتیں  
 ہزار رنگ میں غزلیں کہیں، مگر اے دوست! تیری نگاہ کا پیرایہ بیاں نہ ملا  
 ہمنشیں! نکہتِ برباد کا ماتم کب تک!  
 نشاطِ لغم بھی کیوں بن گئی فغاں جیسے  
 خیال بنتے ہیں مٹتے ہیں، پھر ابھرتے ہیں  
 وہ تیرا پیر ہن سرخ، وہ خرامِ جواں  
 آنکھیں کھلیں، تو دھوپ نے لے لی تھی وہ جگہ  
 نہ بزمِ دوست، نہ صحنِ چمن، نہ روئے نگار  
 افق سے رنگ کٹی پھوٹ کر زمین پہ گرے  
 آنکھیں کو وقت نے سونپی ہے آج راہبری  
 غم تنہائی کے زنداں میں، میں تنہا بھی نہیں  
 قہر یہ ہے، وہ فسونگر ستم آرا بھی نہیں  
 کیسی بہار، آگ لگا دو بہار میں  
 تری نگاہ کا پیرایہ بیاں نہ ملا  
 پھول ہر روز تو کھلتے ہیں گلستانوں میں  
 چھٹی ہے سینہٴ احساس میں سناں جیسے  
 پیا ہے دل میں کوئی محشر نہاں جیسے  
 سفینہٴ رنگ کے دریا میں ہو رواں جیسے  
 سوئے تھے تیرا سایہ دیوار دیکھ کر  
 فریبِ شوق میں اب تک گذر رہی ہے بہار  
 ابھی اڑا تھا مری چشم آرزو سے غبار  
 کہ جن کے نقشِ قدم سے ہیں راستے بزار

## حفیظ ہوشیار پوری، شیخ عبد الحفیظ سلیم

اگرچہ حفیظ اپنے آبائی وطن ہوشیار پور کی نسبت سے مشہور ہوئے، لیکن ان کی ولادت ۵ جنوری ۱۹۱۲ء (۱۵ محرم ۱۳۳۰ھ) کو دیوان پور (ضلع جھنگ، پاکستان) میں ہوئی تھی، جو لائل پور سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب حکومت پنجاب نے منٹگمری، لائل پور، جھنگ وغیرہ کے مغربی اضلاع میں آباد کاری کا کام شروع کیا تھا۔ یہ علاقہ پہلے بنجر اور بالکل غیر آباد تھا۔ حکومت نے یہاں صاحب اثر زمینداروں اور ان اشخاص کو جن کی کچھ سرکاری یا فوجی خدمات تھیں، بڑے وسیع پیمانے پر جاگیریں عطا کیں اور انھیں خاص مراعات دے کر علاقے کے آباد کرنے کی ترغیب دی۔ عبد الحفیظ کے خاندان کی مالی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ ان کے والد شیخ فضل محمد خان تلاش روزگار میں وہاں گئے تھے کہ مٹن ہے کسی زمیندار کے ہاں کچھ لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے۔ اس میں وہ کامیاب ہوئے اور یوں انھوں نے دیوان پور میں سکونت اختیار کر لی۔

شیخ فضل محمد خان کے تین بیٹے تھے، عبدالرشید، عبد الحفیظ، عبد المجید۔ عبدالرشید وہی ہیں، جو دنیا نے ادب میں راجل ہوشیار پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ تاریخ گوئی میں خاص طور پر ان کی بہارت مسلمہ تھی۔ ان کی اردو، فارسی کی تعلیم معقول طریقے پر ہوئی تھی اور اس میں وہ اپنے نانا شیخ غلام محمد کے شاگرد تھے۔ جو پرانی وضع کے اچھے عالم تھے۔ شیخ عبدالرشید کچھ عجیب مراثی مزاج کے



شخص تھے بسنا ہے کہ دن رات گھر کے ایک کمرے میں گوشہ نشین رہتے، اور بہت کم باہر نکلتے تھے۔ دن میں ایک وقت کھانا کھاتے اور جو شخص کھانا لاتا، اسی کے ہاتھ رقعہ بھیج کر، کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہوتی، تو کار بر آری کر لیتے۔ اگر کبھی کمرے سے نکلنا منظور ہوتا، تو رقعہ بھیج دیتے کہ میں فلاں دن، اتنے وقت کے لیے، برآمد ہونگا، اور فلاں فلاں شخص سے ملونگا، اور اس کی سختی سے پابندی کرتے سب سے چھوٹے عبدالمجید کی تعلیم بھی معمولی تھی اور اس کی زندگی بھی بہت غیر منظم تھی۔ گھر کے لوگ ہمیشہ اس کے اطوار سے بہت نالاں رہا کیے۔

عبدالحفیظ کی دسویں درجے تک کی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور میں ہوئی۔ اس کے بعد وہیں گورنمنٹ انٹر کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ حال آں کہ مالی حالات اعلیٰ تعلیم کا بار برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے، اس کے باوجود انھوں نے تہیہ کر لیا کہ تعلیم ضرور مکمل کرونگا۔ چنانچہ لاہور چلے گئے اور گورنمنٹ کالج کے بی۔ اے کے درجے میں داخلہ لے لیا۔ لاہور میں سب سے مشکل مرحلہ سکونت کا تھا۔ یہ اس طرح حل ہو گیا کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم نے انھیں اپنے ہاں رہنے کی اجازت دے دی۔

حفیظ کے ایک ماموں شیخ دین محمد تھے۔ ان کا ہوشیار پور ہی میں کپڑے کا کاروبار تھا اور وہ خاصے متمول آدمی تھے۔ وہ کبھی کبھی کچھ سلوک کر دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ لاہور میں حفیظ کا تعلیمی زمانہ بہت عسرت میں اور گی تشریح سے بسر ہوا۔ بسر اوقات کے لیے وہ خالی اوقات میں نجی طور پر طالب علموں کو پڑھاتے اور بعض رسائل و جرائد میں بھی اجرت پر کام کرتے۔ اسی زمانے میں ان کا تیسرا علماء سید ممتاز علی (ف جون ۱۹۳۵ء) کے ادارے دارالاشاعت اور ان کے پرچے پھول سے تعلق پیدا ہوا۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۳۳ء میں بی اے اور ۱۹۳۶ء میں ایم اے (فلسفہ) کی اسناد لیں۔

۱۹۳۶ء ہی میں میاں بشیر احمد (ف مارچ ۱۹۷۱ء) ایڈیٹر ہمایوں نے انجن اردو

پنجاب کی بنیاد رکھی تھی۔ حفیظ تعلیم سے تو فارغ ہو ہی چکے تھے، اس انجمن کے نائب سکرٹری مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ”ادبی دنیا“ اور چراغ حسن حسرت کے ”نکلان“ کے ادارہ تحریر سے بھی منسلک رہے

۱۹۳۸ء میں سید امتیاز علی تاج (ف اپریل ۱۹۷۰ء) نے انھیں پھول اور تہذیب نسواں کے ادارہ تحریر میں لے لیا۔ اس کے کچھ مدت بعد ہفتہ وار ریاست دہلی میں جگہ مل گئی، تو یہاں چلے آئے۔ لیکن نبھنے نہ سکی، اور چند ماہ بعد واپس لاہور چلے گئے۔

اب ان کا کام اور نام غیر معروف نہیں رہا تھا۔ چنانچہ بعض اجباب کی وساطت سے ۱۹۴۰ء میں ریڈیو کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ اور وہ پروگرام اسٹنٹ بن کر دلی آ گئے۔ اسی سلسلے میں چندے ان کا قیام بمبئی میں بھی رہا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد پھر اسی محکمے میں مدتوں لاہور میں قیام رہا۔ جون ۱۹۵۳ء میں دوسری مرتبہ کراچی میں تقرر ہوا اور زمینہ بزینہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ وہیں سے ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد بھی اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان کی دینی نشریات کے مشیر رہے۔

انھیں تنفس کا عارضہ بہت دن سے تھا۔ کبھی کبھی حالت زیادہ خراب ہو جاتی تھی۔ جولائی ۱۹۷۲ء میں شدید حملہ ہوا، تو اسپتال چلے گئے۔ طویل علاج سے کچھ افاقہ ہوا تو گھر واپس آ گئے۔ لیکن دو تین دن بعد ہی حالت بگڑ گئی اور وہ دوبارہ جناح اسپتال (کراچی) پہنچے۔ وہیں بدھ کے دن ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء صبح گیارہ بجے انتقال ہو گیا۔ اسی شام جنازہ اٹھا اور ہاؤسنگ سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

کئی اصحاب نے تاریخ وفات کہی۔ ان میں سے بیشتر کو ”آہ حفیظ خوش بیاں“ (۱۹۷۳) میں تو وارد ہوا۔ چنانچہ حکیم محمد حسین عرشہ امیر سہری کا قطعہ تاریخ ہے :

چورخت بست زیں جہاں بجانب جناں حفیظ  
غم فراق ترکہ داد بہر دوستان حفیظ  
برائے سالِ رلتش بکنج فکرِ پا زوم  
زہائف آدایں نذاکہ "آہ خوش بیاں حفیظ"  
(۶۱۹۷۳)

صلاح الدین گوہر حزیں کا قطعہ ہے:

کر گئے تاراج بزمِ علم و فن عبد الحفیظ  
شاعر شیریں نوا، روحِ ادب، جانِ غزل  
سن زبانِ بلبلِ باغِ جناں سے سالِ وصل  
اب کہاں سے لائینگے ان کی زباں ان کا قلم  
یہماں قدسیاں ہو کر چلے سو سے عدم  
اور کہہ دئے شاد ہیں عبد الحفیظ اندر ازم

(۱۹۷۳ = ۱۹۷۱ + ۲)

حفیظ کی طبیعت شروع سے حُسن پرست تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہو جاتے۔ اولاً انہوں نے بھی اپنے نانا شیخ غلام محمد سے استفادہ کیا۔ جب ۶۱۹۳ میں ان کا انتقال ہو گیا، تو اپنے بڑے بھائی شیخ عبدالرشید راہل سے رجوع کیا۔ لاہور پہنچے، تو یہاں انہیں حلقہٴ اربابِ ذوق کے نامور اراکین کی صحبت نصیب ہوئی؛ خاص طور پر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سید احمد شاہ بخاری پطرس کی سرپرستی نے ان کے ادبی ذوق پر جلا کی؛ یہ دونوں کالج میں ان کے استاد بھی تھے۔ پطرس کی ترغیب پر انہوں نے انگریزی ادب کا بھی وسیع مطالعہ کیا، بلکہ طالبِ علمی کے دور میں انہوں نے انگریزی میں بھی کچھ نظمیں کہی تھیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے بچوں کے لیے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے، جو "دورنگی" کے عنوان سے غالباً دارالاشاعت نے شائع کیے تھے۔ اس میں اصل انگریزی نظمیں بھی شامل ہیں۔

اول بہت دن تک سلیم تخلص کرتے رہے۔ بعد کو معلوم نہیں، کیوں اسے ترک کر دیا اور حفیظ تخلص اختیار کر لیا۔ وہ غزل اور نظم دونوں کہتے تھے۔ ادائل میں انہوں نے کچھ گیت بھی لکھے، بلکہ کسی زمانے میں وہ سیاسی نظمیں بھی لکھتے

رہے جو تھے وہے میں مہر اور سالک کے روزانہ اخبار ”انقلاب“ (لاہور) میں جو نظمیں ”انقلاب کے خاص شاعر کے قلم سے“ چھپی تھیں، ان کے لکھنے والے حفیظ اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ (ندیم کو چاہیے کہ وہ تعین کر دیں کہ ان میں سے کونسی نظمیں حفیظ کی ہیں)۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا اصلی میدان غزل تھا۔ ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ کے علاوہ فکر کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ ان پر میر کا اثر ضرور تھا، جو زبان کی سادگی، لہجے کے دھیمے پن، اور تحت الشعور کی غمناکی اور افسردگی سے عبارت ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادیت نے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی شستگی، شایستگی اور شیرینی پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے برادر بزرگ کی طرح تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ بیشکلف، تعمیہ یا تخرجہ کے بغیر، مکمل تاریخ نکالتے تھے۔ وہ بحد زود گو اور برحبتہ گو تھے، لیکن پُرگو نہیں۔ فی البدیہہ پیروڈی اور ہزل کہنے میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ اپنے قریبی اور سہرازدوستوں کی محفل میں خوب چہکتے تھے۔ غالباً یہ کلام محفوظ نہیں رہا۔

مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا تھا۔ انہوں نے اسے دو جلدوں میں مرتب کر لیا تھا؛ ہر ایک جلد میں بیس بیس سال کا انتخاب تھا اور کلیات کا نام انہوں نے ”زیر لب“ رکھا تھا، یہ نام بعد کو ایک اور صاحب نے اڑالیا اور اپنی بیوی کے خطوط اس عنوان سے شائع کر دیے۔ اس پر معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ بہر حال یہ دونوں حصے ان کی وفات کے بعد ایک جلد میں ”مقام غزل“ کے عنوان سے شائع ہوئے۔ (کراچی ۱۹۷۳ء) اس میں صرف غزلیات کا انتخاب ہے۔ تاریخوں کا مجموعہ الگ شائع ہوگا۔ انہوں نے کسی زمانے میں سندھی اکاڈمی کی فرمائش پر میر رانجھا کے قصے پر مبنی سندھ میں تصنیف کردہ چار فارسی ٹنویاں بھی مرتب کی تھیں؛ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (کراچی ۱۹۷۵ء)۔

اولاد جسمانی میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بڑی بیٹی (صبیحہ حفیظ



نے امریکا سے ڈاکٹریٹ کی تھی؛ وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات سے منسلک ہے۔ دوسری بیٹی (شمینہ) ریڈیو پاکستان میں ملازم ہے۔ تیسری کا نام عصمت ہے۔ لڑکوں کے نام صہیب اور عمیر ہیں۔

حفیظ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے کچھ نظمیں ضرور لکھیں، لیکن بعد کو یہ میدان یکسر ترک کر دیا۔ جو کلاسیکی رچاؤ، وقار، رکھ رکھاؤ انہوں نے اپنی غزل میں نمایاں کیا، وہ ان کے معاصرین میں سے بہت کم شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ ان کی وضع داری اور کردار کی استواری کا یہ اعجاز ہے کہ نظم کے اس سیلاب میں جو ان کے چاروں طرف رواں دواں تھا، اور جس میں ان کے تمام دوستوں کے پانوڈ ڈگمگائے، وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ نمونے کے چند شعر دیکھیے:

خامشی ہے زبانِ عشقِ حفیظ!	حسن اگر بدگماں نہ ہو جائے
دیکھی ہیں جفائیں بھی بہت عشق میں، لیکن	اب کچھ کبھی نہیں دل کو بجز مہر و وفا یاد
یہ ترکِ محبت ہے کہ تجدیدِ محبت	پہلے سے کبھی آنے لگے وہ مجھ کو سوا یاد
میں یہ حال تھا، گویا	اک شکل تھی پہچانی ہوئی، نام نہ تھا یاد
جب کھلی آنکھ خیال ان کا؛ لگی آنکھ تو خواب	بڑی مشکل سے بسیرات ہوئی ہے مجھ سے
کہاں سے لاؤں عمرِ جاودانی	تراپیاں سہی پیمانِ محکم
محبت کو دعائیں دے رہا ہوں	کہاں میں، اور کہاں یہ دولتِ غم
کوئی دیکھے ہماری سادگی کو	بڑھاتے جارہے ہیں ربطِ باہم
بھی تم یاد آتے ہو، کبھی دل یاد آتا ہے	ہر اک بچھڑا ہوا منزل بمنزل یاد آتا ہے

عشق اک کیف ہے، جس میں نہ مکاں ہے نہ زماں  
کوئی آغاز نہیں تھا، کوئی انجام نہیں  
محبت کی حقیقت، اے حفیظ! اس کے سوا کیا ہے  
بہت مشکل تھا جینا، اس کو آساں کر رہا ہوں میں



پوچھا کسی نے حال تو رک رک کے تیرا نام لب پر مثالِ کوشش ناکام آگیا

دیکھا جو پریشاں حال مجھے اس جانِ محبت نے یہ کہا

ہم نے بھی کیا ہے عشق مگر ایسا تو ہمارا حال نہ تھا

شبِ فراق جو میندا آگئی، تو کیا ہوگا کہ سیلِ نور مرے بام و در سے گزرا ہے

اکھیں بھی آگیا شاید یقین ترکِ محبت کا

طبیعت ان سے مل کر اب پریشاں کیوں نہیں ہوتی!

میانِ عشق و ہوس ہے مقامِ قلب و نظر نہ عشق عینِ حقیقت نہ ہے ہوس باطل

سنار ہا ہوں برنگِ غزلِ زمانے کو حکایتِ غمِ دوراں، فسانہٴ غمِ دل

میں ہوں گناہگار، گناہوں کا ذکر کیا کچھ جبر کے طفیل ہیں، کچھ اختیار کے

دیں سے دیں جنگِ آزما ہے، کفر سے آزردہ کفر

میری مایوسی نزارِ کفر و دین تک ہی نہیں

دامنِ صحرا بھی ہے، اور دامنِ افلاک بھی

اب جنوں محدود حیب و آستین تک ہی نہیں

غم کی چنگاری ازل سے آبِ و گل میں تھی، حفیظ!

سلسلہ اس کا نگاہِ اولیں تک ہی نہیں

میری حالت پہ نہ جا، یوں بھی ہو کرتا ہے پوچھنے والے کوئی بات اگر ہو، تو کہوں

جب کبھی ہم نے کیا عشقِ ایشیاں ہوئے زندگی ہے، تو ابھی اور پشیمان ہونگے

خیالِ ترکِ محبت سے کانپ اٹھتا ہے وہ دل جو تیری محبت میں کامراں بھی نہیں

تفس ہو یا ہوشیہن، سکونِ قلب کہاں سکونِ قلب و ہاں کبھی نہ تھا، یہاں بھی نہیں

ابھی ابھی وہ گئے ہیں، مگر یہ عالم ہے بہت دنوں سے وہ جیسے نظر نہیں آتے

کہیں یہ ترکِ محبت کی ابتدا تو نہیں وہ مجھ کو یاد کبھی اس قدر نہیں آتے

عقیدہ نہیں، ظرف کی بات ہے وہی شے حلال، اور وہی شے حرام

غرض ہو کوئی اُس میں شامل، حفیظ! تو مجھ پر ہے در و محبت حرام

## تذکرہ معاصرین

میں اماں نہ ملی گوشہ و نفس کے سوا وہ طائروں پہ سر شاخسار گزری ہے  
 خزاں نصیب یہ سمجھ کہ آگئی ہے بہار حفیظ! جب بھی خمین سے بہار گزری ہے  
 دل کی دنیا اس قدر آبا د ہے جس قدر ویراں ہیں چشم و گوش و لب

اب ان کے حُسن میں، حُسنِ نظر بھی شامل ہے  
 کچھ اور میری نظر سے نگھر گیا کوئی  
 کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی  
 ہزار بار اٹھا، سوے در گیا کوئی  
 اٹھا پھر آج مرے دل میں اٹک کا طوفاں  
 پھر ان کی راہ سے با چشمِ تر گیا کوئی  
 کوئی زین سے بھی پہنچاٹے آسماں کو پیام  
 پیام اہل زین کو تو آسماں سے ملے

جب خموشی پہ تکلم کا گماں ہوتا ہے دل پہ وہ لمحہ غم سخت گراں ہوتا ہے  
 دیکھا جاتا نہیں محرومیِ دل کا عالم جب غمِ عشق نصیبِ دگراں ہوتا ہے  
 اب تو پہلی ہی ملاقات میں، ہر صورت پر کسی دیکھی ہوئی صورت کا گماں ہوتا ہے

مجھ پہ گزری تھی نہ وہ، تجھ سے جدا ہونے پر  
 اتفاقاتِ ترے ملنے پر جو مجھ پر گزری  
 آج کچھ حال ہی ایسا تھا کہ لب تک آئی  
 ورنہ یہ بات مرے دل میں تو اکثر گزری  
 کیوں نہ مانوس ہو دل غم سے جدائی میں، حفیظ!  
 ان سے ملنے پہ بھی حالت وہی اکثر گزری

مجھ ہو کے پھر تری محفل میں جائینگے مایوس ہو کے جو تری محفل سے آئے ہیں  
 قرار دل کو اندہ آسودگی نظر کے لیے یہ آزمائشِ قلب و نظر، بشر کے لیے!  
 نظر سے حد نظر تک، تمام تاریکی یہ اہتمام ہے، اک وعدہ سحر کے لیے

جانے، کیا بات ہونے والی ہے دل پر لیشاں ہے آپ سے مل کر  
 تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا  
 کب ملتی ہے یہ دولت بیدار کسی کو اور میں ہوں کہ رونا ہے اسی دیدہ وری کا  
 اب خانقہ و مدرسہ و میکرہ ہیں ایک اک سلسلہ ہے قافلہٴ بخسبری کا  
 دل میں ہو فقط تم ہی، تو آنکھوں پہ نہ جاؤ آنکھوں کو تو ہے روگ پر لیشاں نظری کا  
 وہ مجھ پہ ہر باں تھے، ابھی کل کی بات ہے اور سوچیے، تو جیسے زمانے گزر گئے  
 دیر و حرم کی منزل دشوار ہے، حفیظ! ہم ان کی جستجو کے بہانے گزر گئے  
 دعویٰ ترکِ محبت تو بڑی بات ہے، خیر بھول ہی جائیں تمہیں ہم سے نہ اتنا بھی ہوا

کبھی دشمن چلے اور ہاتھ میں خنجر لیے نکلے

کبھی احباب اٹھے، اور دشمنہ زیرِ آستین آئے

حفیظ! کون ہے تسکینِ خواب کا منکر، یہ اور بات ہے، توفیقِ خواب ہی نہ ہے

بھول گئے ان کی ہر اک بات کو ہم سے یہ اک کام بڑا ہو گیا

ترکِ محبت ہی سہی اب، حفیظ! فرضِ محبت تو ادا ہو گیا

پھر آئیں، حفیظ! یا نہ آئیں جو کہنا ہو، آج ان سے کہ لے

یہ خود فریبی کہ صبح ہوگی، تمیزِ لیل و نہار تک ہے

کہ انتہائے شبِ جدائی، طلوعِ شمعِ مزار تک ہے

یہ عشق وہ دردِ جانستال ہے، کوئی نہیں رازدار جس کا

کہ اس کی یورشِ غمِ نہاں سے تبسمِ آشکا تک ہے

چراغِ مہر و وفا جلانے، مگر وہی تیسرگی کا پہرا

سوادِ دیرِ بتاں سے لے کر حرم کے قرب و جوار تک ہے

بقدرِ توفیقِ پہرہ و رمبو، تصرفِ دردِ آرزو سے

کہ ابتداً قدیار سے ہے، تو انتہا اوجِ دار تک ہے

دور اور قرب کا اتنا احساس کہ ابھی جیسے یہاں تھا کوئی

کہاں کا عشق کہ اب رسم و راہ بھی تو نہیں  
 جو روز تھی، وہ نظر گاہ گاہ بھی تو نہیں  
 عذابِ جاں ہی سہی عشق، لیکن اس کے بغیر  
 غمِ زمانہ سے کوئی پناہ بھی تو نہیں  
 جب ابتداءے محبت ہی بس کی بات نہ تھی  
 تو اہل عشق پہ لازم نساہ بھی تو نہیں

اشک آنکھوں میں ہیں، رسم و اوضاع داری ہوگی کتنی مشکل تیرے غم کی پاسداری ہوگی

کئی در کھلے بند ہوتے گئے درِ میکرہ باز تھا، باز ہے

مجھے قریب جلوہ نے دھوکہ دیا بہت دور جلوہ گیر ناز ہے

فشار سے ہیں وہ اک موجِ رنگِ سرتاپا یہ تنگ پیرہنی ہے دلیلِ گلبدنی

دوستی عام ہے لیکن، اے دوست! دوست ملتا ہے بڑی مشکل سے

ہم کو منزل نے بھی گمراہ گیا راستے نکلے کئی منزل سے

دیر تک اک فسانہ سناتے رہے ذوقاً رک گئے آکے اک نام تک

ہر عیشِ اذیت دیتا ہے، ہر درد میں لذت ہوتی ہے

اور اس کے سوا ہم کیا جانیں، کیا چیز محبت ہوتی ہے

جب تک ہوئے نہ تلخیِ ہجرال سے آشنا نا آشنا ہے، ترے لطفِ نہاں سے ہم

مجھ تو لب ہیں ساحلِ طوفانِ گفتگو دیکھو، تو آرہے ہیں نظرِ یزباں سے ہم

ہزاروں زخم ابھر آتے ہیں اک حرفِ تسلی سے پرانے زخم اگر آسودہ مرہم بھی ہوتے ہیں

پُرششِ غم کا قرینہ مت پوچھ ان کی آنکھوں میں زباں ہو جیسے

دل سے آتی ہے بات لب پہ، حفیظ! بات دل میں کہاں سے آتی ہے؟

واہانڈہ دیارِ بستال، راندہ حرم خود ناشناس ہم ہیں، خدا ناشناس ہم

ترے لطف و کرم ہیں، تو بھی ہے تیری وفا بھی ہے

مگر کوئی مددوا، اس دلِ بیتاب کا بھی ہے؟

## فرقت کا کوروی، غلام احمد

ان کا خاندان یوپی کے مشہور قصبہ کا کوروی کا رہنے والا تھا۔ فرقت نے اپنے مجموعہ کلام "ناروا" میں اپنے جو مختصر حالات شامل کیے ہیں، ان میں مشہور نعت نگار مولوی محمد محسن کا کوروی (ف اپریل ۱۹۰۵ء) کو اپنا جد امجد لکھا ہے۔ ٹھیک رشتہ یہ ہے کہ محسن کا کوروی مرحوم فرقت صاحب کی نانی (نادر النساء بیگم) کے سگے ماموں زاد بھائی تھے۔ اس سے ثابت ہے کہ ان کا خاندان عمائد خطہ میں سے تھا۔ فرقت کے والد شوکت علی بلحاظ پیشہ اور سیرتھے۔ شوکت علی کی شادی جناب انیس احمد عباسی کی ہمیشہ سے ہوئی تھی۔ ان کا نام اقتشام النساء (عرف شہزادی) تھا؛ وہ بھی فرقت کی رحلت کے چند ماہ بعد رگراے عالم بقا ہوئیں۔

اگرچہ فرقت نے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے لیکن شمیم کرمانی صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ وہ غالباً ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے کیونکہ ۱۹۷۲ء میں انہوں نے شمیم صاحب کو بتایا تھا کہ میں ۴۲ سال کا ہو چکا ہوں۔ سرکاری کاغذات میں تاریخ ولادت میں اس طرح کی غلطی، بالخصوص عمر کم بتانا، عام ہے۔ میرے خیال میں بھی ۱۹۱۰ء کی تاریخ زیادہ قرین قیاس ہے۔ فرقت صاحب لکھنؤ (گولہ گنج اسپتال) میں ستوائسے پیدا ہوئے تھے، اسی لیے وہ عمر بھر قوام کے پتلے اور کمزور رہے۔ لیکن ان کا بچپن کا کوروی میں گزرا۔

شوکت علی کے تین اولادیں ہوئیں؛ انتخاب طاہر، غلام احمد (فرقت) احمد توفیق



مولوی۔ بد قسمتی سے شوکت علی کا عین جوانی (غالباً ۱۹۱۶ء) میں انتقال ہو گیا۔ گھر میں کچھ اندوختہ تو تھا نہیں، خاندان کے لیے زندگی دشوار ہو گئی۔ بارے، شیخ صفدر علی صاحب (موتوئل دربار رامپور) آڑے آئے، انہوں نے پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، جس سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے میں کچھ مدد ملی۔ سستے کا زمانہ تھا، تنگی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ لیکن یہ قوتِ لایوت بچوں کی تعلیم کا بار اٹھانے سے قاصر تھی۔

فرقت بڑے بیٹے تھے، پہلے وہی تعلیم کی منزل کو پہنچے۔ بہت دن تک محلے کے ایک مولوی صاحب سے اردو، فارسی پڑھتے رہے، جس میں خرچ برائے نام بھی نہیں تھا۔ پھر گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ درمیان میں کوئی سال ایک کے لیے اپنے بڑے ماموں مولوی رئیس احمد عباسی کے پاس سلطا پور چلے گئے۔ عباسی صاحب وہاں عدالت میں منہم اور اچھے صاحبِ حیثیت بزرگ تھے۔ فرقت پانچویں درجے میں تھے، جب وہ سلطا پور گئے ہیں۔ لیکن بد قسمتی کا کیا علاج! اُس نے یہاں بھی پچھانہ چھوڑا۔ ابھی یہ ساتویں میں تھے کہ مولوی رئیس احمد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور یوں وہ پھر ایک مرتبہ بے یار و مددگار رہ گئے، اور انہیں واپس لکھنؤ آنا پڑا۔ اس وقت عمر ۱۳-۱۴ برس کی ہوگی۔ یہاں ان کا قیام محلہ باورچی ٹولہ کے ایک مکان میں تھا۔ لیکن آفرین ہے ان کی ہمت کو! انہوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں دو مقبول روزنامے ”ہمد“ اور ”حقیقت“ تھے۔ روزانہ علی الصبح اسکول جانے سے پہلے گلی کوچوں میں پھر کر ”حقیقت“ کے سونو پرچے بیچ ڈالتے۔ اس سے روزانہ کم و بیش آٹھ دس آنے کی آمدنی ہو جاتی جو بالکل ناکافی تھی، لیکن بالکل کچھ نہ ہونے سے کچھ بہتر ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کا کام لینے کے لیے تگ و دو شروع کی۔ قسمت یاد رہتی کہ ان کی کم عمری کے باوجود کچھ کام مل گیا۔ اس سے تین روپیہ مہینا ملنے لگا، جو اور نہیں تو اسکول کی فیس کے لیے کافی تھا۔

اس کے بعد انہوں نے ۱۶-۱۷ برس کی عمر میں ایک دوست کی شراکت سے کچھ کاروبار

بھی کیا۔ دراصل یہ سب پاپڑا نہیں اپنی تعلیم اور خاندان کی کفالت کے لیے روپیہ پیدا کرنے کے واسطے بیٹنا پڑے۔ بارے، کن مشکلوں سے ۱۹۳۱ء میں انٹری پاس کیا؛ اور اب یہ اسی روزنامہ "حقیقت" کے نائب مدیر ہو گئے؛ جسے کسی زمانے میں آوازیں لگا لگا کر گلی کوچوں میں بیجا کرتے تھے۔ وہ اس میں خبروں کے علاوہ مزاحیہ کالم بھی "کف گلفروش" کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔

تعلیم ہنوز نامکمل تھی۔ انھوں نے غالباً ۱۹۳۶ء میں پرائیویٹ طور پر لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ مولوی انیس احمد عباسی (ایڈیٹر و مالک "حقیقت") نے جو ان کے حقیقی ماموں بھی ہوتے تھے، اسی زمانے میں ایک ہفت روزہ (انگریزی) "نیوکریسنٹ" جاری کیا تھا۔ انھوں نے فرقت کو اس کے عملے سے بھی منسلک کر لیا۔ لیکن یہ پرچہ دو سال بعد مالی مشکلات کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اب فرقت نے اپنا ذاتی اخبار "صدائت" (ہفتہ وار) کے نام سے نکالا۔ یہ ششم پشتم دو سال چلا۔ اس پر فرقت صحافت سے مایوس ہو گئے۔ خیال کیا کہ کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کیا جائے۔ اس میں انھیں کہاں کہاں کے کنوئیں نہیں جھانکنا پڑے۔ درزی کا کام سیکھا اور کٹائی کے کام میں مہارت پیدا کر کے حکومت کے سلائی کے کارخانے (شاہجہاںپور) میں بطور نگرال (سپر وائزر) ملازم ہو گئے۔ لیکن فیکٹری کے گرد و نواح کے مخدوش حالات دیکھ کر طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور وہیں میونسپلٹی کے دفتر میں کلرک کر لی۔ پھر وہاں سے لکھنؤ سکرٹریٹ میں منتقل ہو گئے۔ اسی قیام لکھنؤ کے دوران میں (۱۹۴۵ء) لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے (تاریخ) کی سند لی۔ ۱۹۴۷ء کے زمانے میں وہ یوپی حکومت میں فیلڈ پیلسٹی افسر کے دفتر میں غالباً کسی ضلع کے انچارج رہے۔

اب انھوں نے تعلیمی شعبے میں ملازمت حاصل کرنے کی کھانی اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ اول، اواخر ۱۹۴۷ء میں حلیم کالج، کانپور میں تاریخ پڑھانے پر مقرر

ہوئے۔ ایک سال بعد ۱۹۴۸ء کے آخر میں اینگلو عربک اسکول، دہلی میں آئے اور یہاں کبھی تاریخ کے مدرس ہی کا عہدہ ملا۔ یہیں سے انھوں نے دوبارہ ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کیا۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایڈ کی سند لی۔ وہ آخر تک اسی اسکول کی ملازمت میں رہے۔

جولائی ۱۹۴۱ء میں ان کے ماموں مولوی انیس احمد عباسی (ف نومبر ۱۹۷۵ء) نے اپنی صاحبزادی رئیس بانو (۶۰ ف سٹرو) ان کے عقد نکاح میں دے دی۔ سات سال بچے موجود ہیں: طارق، توقیر، رافع، طیب اور تاج، پانچ بیٹے اور رعنا اور صبوحی دو بیٹیاں۔ ان کے چھوٹے بھائی احمد توفیق علوی لا ولد تھے، اس لیے بڑا بیٹا طارق انھیں دے دیا تھا۔ ابتدائی زمانے کی عسرت اور روزانہ رات گئے تک کام کرنے اور جاگنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیند بہت کم ہو گئی تھی۔ بعض اوقات متواتر کئی کئی دن بن سوئے گزر جاتے تھے۔ اس سے صحت مستقل طور پر مخدوش ہو گئی۔ عین عنفوانِ شباب میں سل کا حملہ ہوا اور منہ سے خون آیا۔ بارے، اس سے جان تو بچ گئی، لیکن دمہ سدا کا ساتھ بن گیا۔ خوراک میں گوشت سے کمالاً اجتناب تھا، صرف سبزی ترکاری کھاتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، ہمیشہ دونوں وقت ٹھنڈے سے پانی سے نہاتے اور یہ روزانہ کا معمول تھا۔

وہ بدھ کے دن ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جھریا (بہار) گئے۔ جمعہ ۱۲ جنوری کو وہاں سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ شب دورانِ سفر میں طبیعت یکایک خراب ہو گئی۔ ہفتے کی صبح ۱۳ جنوری کو جب گاڑی منگل سرائے پہنچی، تو ڈبے میں ان کی لاش ملی چونکہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ لاش کس کی ہے، پوسٹ مارٹم کے بعد اسے بنارس کی اسلامی انجمن کے سپرد کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے اسی شام نہلا ڈھلا کر گنج شہیدان، اردلی بازار کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ بیوی بچوں میں سے کسی کو شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مارادیا ر غیر میں مجھ کو، وطن سے دور

رکھ لی مرے خدانے، مری بیکسی کی شرم

فرقت کا شروع ہوا، اخباروں سے جو واسطہ پڑا، تو اس سے انہیں مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ جو ملتا، اسے چاب جاتے۔ آہستہ آہستہ خود لکھنے لگے۔ طبیعت میں چلبلا پن تھا، اس لیے قدرتاً مزاح کی طرف مائل ہو گئے۔ ”حقیقت“ میں ”کفِ گل فروش“ مزاحیہ کالم ان کے حوالے ہو گیا، تو اس سے جہاں قلمرو وسیع ہو گئی، وہیں ذمہ داری کا احساس بھی بڑھ گیا۔ وہ ترقی پسند مصنفین کی پیرا ہروی اور سطحیت کے مخالف تھے، ان کے خلاف ان کا جہاد آخر تک قائم رہا۔ ان لوگوں نے بھی فروت کو منہ نہیں لگایا اور جتنی اہمیت انہیں ملنا چاہیے تھی، نہیں دی۔

فرقت کے مزاح کی جڑیں تو لازماً نچھی صحافت میں دیکھی جاسکتی ہیں، لیکن ان کے طنز نے لفظی قلابازیوں سے جو نچھی اخباروں کا طرہ امتیاز تھا، آگے گزر کر اس میں گہرائی اور مقصدیت پیدا کر دی تھی۔

انہوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا؛ اور اس میں آرزو لکھنوی (ف اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کیا۔ استاد کے زیر اثر وہ ۱۹۳۶ء تک سنجیدہ شعر کہتے رہے۔ لیکن طبیعت کی جولانی نے اس کے بعد مزاح کے میدان میں پہنچا دیا۔ ان کی بعض مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں:

مداوا (۱۹۴۴ء)؛ ناروا (۱۹۴۶ء)؛ کفِ گل فروش (۱۹۵۵ء)؛ مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں؛ صید و ہدف؛ شوخی تحریر؛ اردو ادب میں طنز و مزاح (۱۹۶۴ء)؛ مزاحیہ شرح دیوانِ غالب (۱۹۶۴ء)؛ غالب خستہ کے بغیر (۱۹۷۰ء)؛ قد مچے (۱۹۷۱ء)؛ ایک آدھ کو چھوڑ کر یہ سب کتابیں لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔

مندرجہ ذیل چند شعرا کی آخری بیاض سے لیے گئے ہیں اور ان میں سے غالباً بیشتر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں:

نئی جیل، لمبی حوالا ستہ ہوگی ہراک رات نغموں بھری رات ہوگی



جہنم میں جانے کی اتنی خوشی ہے کہ سب شاعروں سے ملاقات ہوگی

جب تھا زندہ تو اڑا رکھا تھا مرحوم ہوئے

اب جو مرحوم ہوں، فرماتے ہیں حال اچھا ہے

اپنا کل قسطنطنیہ دیکھتے طلب کر بیٹھے

ان سے طنزاً جو کہا میں کہ حال اچھا ہے

اپنے عشاق سے سب لڑکیاں شادی کر لیں

یہ ترے باپ کی خواہش، یہ خیال اچھا ہے

ماں میں، باپ مرے، شیخ الکشن ہارے

اک برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

شیخ جی اس لیے فوٹو نہیں کھنچواتے ہیں تاکہ حوریں کہیں پہلے سے انہیں دیکھ نہ لیں

اور جب مر کے بعد شوق یہ جنت پہنچیں تو وہ اندر سے کواڑے نہ متقل کر دیں

جتنے شاعر ہیں وہ عشاقِ صنم ہوتے ہیں شعر کہ کر غم معشوق میں سب روتے ہیں

لیکن اک بات یہ اب تک نہ سمجھ میں آئی گھر میں کیوں جا کے یہ بیوی کے قدم دھوئے ہیں

حسن اور عشق کی مل جل کے بسر ہو کیسے!

وسل آساں ہے بہر حال، مگر ہو کیسے!

قحط شکر کا ہے، محبوب بھی کہتے ہیں بجا

ایسی حالت میں کوئی شیر و شکر ہو کیسے!

شیخ جی گھس گئے جنت میں نہ جانے کیسے

اور پھر واں سے نکالے گئے جیسے تیسے

پوچھا لوگوں نے: حضرت! آپ پلٹ کیوں آئے

بولے: واں کبھی ہیں یو کہیں لوگ کچھ ایسے ویسے

عشق کو متفر کیا، آج کے نوجوان نے صبح سے عاشقی چلی، شب کو تمام ہو گئی

آپ سے سب کو پیار تھا، آپ سے رسمِ دراہی آپ کا عقد ہو گیا، بات تمام ہو گئی



چکے سے وہ توپل دیے عشق کے "بیک ڈو" عشق کی انتظار میں عمر تمام ہو گئی

آپ مجھے برا کہیں، باپ مگر نہ کچھ کہیں  
 آپ کی بات اور ہے، باپ کی بات اور ہے  
 لاتوں کا ہے معاملہ، زندگی اور موت کا  
 ایک کی لات کھا چکے، ایک کی لات اور ہے  
 آنکھ سے آنکھ لڑ گئی، کونسی پھر کس رہی  
 نصف نکاح ہو چکا، نصف کی بات اور ہے  
 اس لیے حسن و عشق میں روز ازل سے میر ہے  
 دونوں کے باپ لاپتہ، دونوں کی ذات اور ہے  
 عشق کے دم پہ بن گئی، حسن نے "وارننگ" جودی  
 آج کی چھوٹ اور ہے، آج کی رات اور ہے  
 عشق کے درد کی دوا، ایک نقطہ نکاح ہے  
 وہ ہے "فراڈ" جو کہے، راہِ نجات اور ہے

ادھار

ہم کو ملازمت جو کھڑے گھاٹ مل گئی  
 چھٹی پھران کو ہم نے بسذشوقیوں لکھی  
 پانچھوں کی ناؤکانوں کے ساحل سے جا لگی  
 "آیا کرو ادھر بھی" مری جساں کبھی کبھی

قرضے سے ہائے تم تو پریشان ہو گئے  
 لو خوش ہو، لین دین کے سامان ہو گئے

دل نے کہا کہ جھوم کے نعرے لگائیے  
 بیوی کو ایک خط میں یہ لکھ کر بلائیے  
 تختی لگا کے پیٹھ پہ اب گھوم جائیے  
 میسے کو چھوڑ چھاڑ کے اب جلد آئیے

آجائیے، تول کے مہاجن کو لوٹ لیں

قرضہ وہ لیں کہ اصل کبھی دیں نہ سو دیں

وہ قرض پھر لیے ہیں کہ اللہ کی پناہ! روپے اسی سے لے مرے جس پر پٹری نگاہ

پھر ان کے بھاگنے کی ہی چھوڑی نہ کوئی راہ سب کے لنگوٹی بندھ گئی، حالت ہوئی تباہ

یارانہ تھا نفساں کا، نہ موقع تھا آہ کا

بتا پھٹا ہوا تھا، ہر اک قرضخواہ کا

قرضے پہ ہم نے ایک مکان ایسا لے لیا جس میں کہ دو طرف سے تھا جانے کا راستا

جب سارے قرضخواہوں کو اس کا پتہ چلا ہر فرد لے کے اپنا ہی کھاتا آگیا

تھا اک طرف سے شور کہ تشریف لائے

سناٹا کہہ رہا تھا کہ ڈنڈے بجائے

پہلی جو آئی، ایک قیامت مچا گئی بل لے کے قرضخواہوں کی اک فوج آگئی

یوں عاقبت کا راستا ہم کو دکھا گئی دل نے کہا کہ اٹھیے، حلفت! موت آگئی

ہر قرضخواہ حد ادب نا گھسنے لگا

دل اپنی مغفرت کی دعا مانگنے لگا

ہر سمت لاڈ لاڈ کے گرنے لگے جو ہم گریا یا دل، تو آیا طبیعت میں پیچ و خم

بنیا بغل سے بولا کہ دلوائیے رقم کہنے لگا مغلیہ کہ کب سے کھڑے ہیں ہم

رہ رہ کے اپنی بوٹیاں ہم نوچنے لگے

اور خود کشی کی راہ نئی سوچنے لگے

پُر کیف زندگی ہے فقط قرضخواہ کی دنیا میں اس سے بڑھ کے سعادت کسے ملی

کچھ بد نصیب کرتے ہیں ان پر تھڑی تھڑی کیا جانیں وہ کہ چیز ہے کیا نادہندگی

کنگن بھی ہے جڑاؤ، یہی ہتھکڑی بھی ہے

گولس میں روپیہ ہے، مگر بے بسی بھی ہے

ہے قرض کی یہ شان کہ لو اور کبھی نہ دو دس بیس ہاتھ کھاؤ، تو دو چار خود دھرو

مرنے پہ قرضخواہوں کے چندے سے یوں اٹھو دھیلا نہ اپنا خرچ ہو، اس ٹھاٹھ سے مرو

لے کر رقم جو دو گے، تو بخشے نہ جاؤ گے

کس کس کا قرض حشر میں جا کر چکاؤ گے

چھ سات سال قرض کے پیسے نہ جب دیئے دس بیس سو دو خور تو یوں ہی ڈھلک لیے  
 جو اُدھ مڑے تھے وہ بھی تھے کچھ ایسے کج دلی بیصبر ہو کے بولے، حضرت! ہم تو اب چلے  
 وہ ہم نے قرض خواہوں کی مٹی پلید کی  
 وہ خود تو مر گئے، پہ رقم ان کی رہ گئی

تضمین

ہاتھ پیر اور جسم اچھا چاہیے ڈھیر سا پھر اس پہ پیسا چاہیے  
 ”چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے“

منہ چھپانے میں ہے کیا فرزانگی آئیے ہم بھی تو دیکھیں بانگی  
 ”دوستی کا پردہ، ہے بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے“

پوچھو بکرے سے کہ کیا ہے بقرعید چھوٹتے جل کر کہیگا، چل یزید! ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے  
 ”منہ مرنے پہ ہو، جس کا امید“

ہم تمہیں اس وقت غالب مانتے جب کسی گھرد جوان کو گانٹھتے  
 ”غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے“

ہے بڑھاپے میں ہوس کی کوئی حد جب کہ گھر والی کیسے بیٹھی ہو زد  
 ”چاہتے ہو خوب رویوں کو اسدا! آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے“

## محمد اکرام، شیخ

ان کا آبائی وطن وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ، پاکستان) تھا، جہاں ان کا خاندان ممتاز تھا۔ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے۔ لیکن اکرام صاحب کی پیدائش ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء کو چھوٹے سے قصبہ چک جہرہ (ضلع لائل پور، پاکستان) میں ہوئی، جہاں اس زمانے میں ان کے والد اپنے کاروبار کے سلسلے میں مقیم تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم مشن ہائی اسکول، وزیر آباد میں پائی، اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں ایم، اے کی سند لی۔ اسی سال انڈین ہول سروس کے مقابلے کے امتحان بیٹھے اور کامیاب ہو گئے۔ انگلستان میں انھوں نے ٹریننگ کے زمانے میں جینرل کالج، آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ اس زمانے میں انھوں نے جرمن کا بطور ثانوی زبان کے انتخاب کیا اور اس میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

وہ ۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو حکومت ہند کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ان کا تقرر ٹبسی کے صوبے میں ہوا تھا۔ ۱۹۴۴ء تک وہ کیرا اور سورت اور پونا میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ضمناً یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھیں مراٹھی زبان میں بھی اعلیٰ استعداد حاصل تھی۔ ۱۹۴۴ء کے نصف آخر میں وہ مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات و نشریات میں ڈپٹی سیکرٹری مقرر ہو کر دلی آ گئے۔ وہ اسی عہدے پر تھے جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد اور تقسیم ہوا ہے۔ اس پر وہ پاکستان منتقل ہو گئے۔

پاکستان میں بھی وہ زیادہ تر وزارت اطلاعات و نشریات ہی سے وابستہ رہے۔

بالآخر ۱۹۶۶ء میں وہ یہاں سے سکٹری کے عہدے سے پینشن پر سبکدوش ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کچھ مدت کے لیے بورڈ آف ریونیو کے رکن اور ایک سرکاری ادارے کے صدر بھی رہے تھے۔ سرکاری ملازمت سے الگ ہونے کے بعد وہ اپنی وفات تک ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور کے مدیر اعلیٰ رہے۔

آخری دو ایک برس میں انھیں اختلاج قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اسی کے علاج کے لیے میوا اسپتال، لاہور میں داخل ہوئے تھے، جہاں بدھے اجنوری ۱۹۷۳ء کی شب میں راہی ملک عدم ہو گئے۔ جنازہ جمعرات کی سہ پہر میں اٹھا۔ لاہور کے مشہور قبرستان ”میانی صاحب“ میں سپرد خاک ہو گئے۔ وسیع حلقہء اجباب کے علاوہ اپنے پیچھے تین لڑکے اور ایک لڑکی سوگواروں میں چھوڑے۔

ملازمت اور حکومت میں اعلیٰ عہدے اپنی جگہ لیکن دراصل ان کا مزاج علمی اور تحقیقی تھا۔ مطالعے اور علم و ادب کا شوق ان کی گھنٹی میں پڑا تھا۔ گورنمنٹ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں وہ کالج کے ماہانہ رسالے ”راوی“ کے بہرہ اردو کے مدیر رہے۔ اسی زمانے میں ان کے کچھ مضمناں بہ معاصر چوں میں بھی شائع ہوئے۔

وہ پونا میں تھے، جب انھوں نے ۱۹۳۶ء میں ”غالب نالہ“ کے نام سے غالب کی سوانح عمری شائع کی۔ میرزا کی سیرت کے بارے میں یہ پہلی علمی کوشش تھی۔ اس کے ساتھ انھوں نے میرزا کے اردو اور فارسی کلام کو بھی تاریخی ترتیب سے جمع کرنے کی کوشش کی اور اسے ”ارمغانِ غالب“ کے نام سے الگ شائع کیا۔ دونوں کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ بعد کو سوانح اور نقدِ کلام کی الگ الگ جلدیں ”حیاتِ غالب“ اور حکیم فرزانہ کے نام سے چھپیں۔ پھر اسی انداز پر مولانا شبلی نعمانی کی سوانح حیات ”شبلی نامہ“ لکھی، جو بعد کو معتد بہ اضافوں کے ساتھ ”یادگارِ شبلی“ کے عنوان سے دوبارہ شائع ہوئی۔ انھوں نے مسلمانان ہند کی تمدنی اور ثقافتی، علمی اور مذہبی تاریخ ان کے علماء اور مفکرین کے سوانح اور سیرت



کے آئے میں تین مجلدات میں مرتب کی (آب کوثر؛ رود کوثر؛ موج کوثر) ایک ضخیم جلد میں "پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ" انگریزی میں شائع کی گئی جس کا انگریزی خلاصہ بعد کو پروفیسر انسلی، ٹی، ایمری نے "ہندستان میں مسلم ثقافت" کے نام سے امریکا سے شائع کیا تھا۔ انھوں نے اسے، آرا البیرونی کے فرضی نام سے ایک اور انگریزی کتاب *MAKERS OF PAKISTAN* (پاکستان کے معمار) کے نام سے بھی لکھی تھی۔ بعد کو یہی کتاب خاصے روڈ بدل کے ساتھ *MODERN MUSLIM INDIA & BIRTH OF PAKISTAN* کے نام سے شائع ہوئی۔ اس موضوع پر یہ غالباً بہترین کتاب ہے۔

۱۹۴۹ء میں (یا شاید ۱۹۵۰ء) میں شہنشاہ ایران، پاکستان کے دورے پر تشریف لائے گئے۔ اس موقع پر ان کی خدمت میں پیش کرنے کو اکرام صاحب نے ہندستان/پاکستان کے فارسی شعرا کا انتخاب مرتب کیا تھا، جو کتابت و طباعت کے خاص اہتمام سے "ارمغانِ پاک" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان کی کچھ اور تصنیفات بھی ہیں، جن میں سے بعض پر ان کا نام موجود نہیں ہے۔

## ممتاز شیرین

ان کا آبائی وطن بنگلور تھا، لیکن وہ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۴ء کو میسور میں پیدا ہوئیں۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں مہارانی ہائی اسکول، میسور میں پائی اور اس کے بعد مہارانی کالج، بنگلور ہی میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے ۱۹۴۲ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ شروع سے سنجیدہ مزاج تھیں؛ چنانچہ بی اے میں ان کے مضامین: عمرانیات (سوشیالوجی)، نفسیات (سائیکولوجی)، معاشیات (اکنامس)، تاریخ اور فارسی تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہیں، نہ صرف ہمیشہ ہر درجے میں اول آئیں، بلکہ انفرادی طور پر بھی ہر ایک مضمون میں سر فہرست رہیں۔ جب تقسیم ملک کے بعد پاکستان گئیں، تو وہاں کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی سند لی۔ یورپ جانے کا موقع ملا، تو چندے آکسفورڈ یونیورسٹی میں جدید انگریزی تنقید کے اسباق میں بھی حصہ لیا تھا، لیکن وہاں سے غالباً کوئی سند حاصل نہیں کی۔ وہ آکسفورڈ میں دو برس رہ کر ڈاکٹر آف فلاسفی (ڈی فل) کی ڈگری لینا چاہتی تھیں، لیکن مالی عدم استطاعت نے اس کا موقع نہ دیا اور وہ واپس وطن چلی آئیں۔

۱۹۴۲ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد ہی ان کی صمد شاہین سے شادی ہو گئی تھی۔ یہ رشتے میں ان کے عزیز بھی تھے؛ انھوں نے اسی زمانے وکالت کی سند لی تھی۔ اس شادی کا نتیجہ دو بچے ہیں؛ پرویز اور گلریز۔ صمد شاہین نے بعد کو ڈاکٹریٹ کر لی اور سرکاری ملازمت میں شامل ہو گئے۔

اس سلسلے میں انھیں بیرون ملک کئی جگہ قیام کرنا پڑا۔ پہلے مغربی یورپ میں تقرری ہوئی، بعد کو سیٹو کے صدر دفتر، بنکاک (تائی لینڈ) میں پہنچ گئے۔ صدر شاہین بدرتج بیورو آف ریفرنس اینڈ ریسرچ میں جوائنٹ ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۵۲ء میں ہالینڈ کے دارالخلافہ ہیگ میں ایک بین الاقوامی ادبی کانگریس منعقد ہوئی تھی؛ ممتاز شیریں نے اس میں اپنے ملک کی نمائندگی کی تھی۔ وہ جہاں بھی گئیں، انھوں نے وہاں کے ادیبوں سے تبادلہ خیالات کیا اور اس سے ان کے فکرو فن کو بہت فائدہ پہنچا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ پاکستان کی وزارتِ تعلیم سے بحیثیت مشیر منسلک ہو گئی تھیں۔

ممتاز شیریں کو ۱۹۷۲ء کے اواخر میں انٹریوں کے سرطان کا عارضہ لاحق ہو گیا؛ اور یہ نامراد مرض اتنی تیزی سے پھیلا کہ بروقت پورے طور پر علاج کا بھی انتظام نہ ہو سکا۔ فروری میں انھیں علاج کے لیے اسلام آباد کے پولی کلینک (ہسپتال) میں داخل کیا گیا۔ وہیں چند ہفتے بعد ۱۹۷۳ء کو دن کے دو بجے (بیمہ ۲۸ سال) انتقال ہوا۔ اسی شام تدفین عمل میں آئی۔

انھوں نے کالج کے زمانے ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ ”انگریزی“ ۱۹۴۲ء میں چھپا، تو لوگوں نے محسوس کیا کہ اردو کے افسانوی فن پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ”دیک راک“ اور ”سیگھ بھار“ جیسے طویل افسانوں سے بہاں اردو میں نئے تجربے کیے، وہیں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ پھر انھوں نے ۱۹۴۴ء میں اپنے شوہر صدر شاہین کی معیت میں بنگلور سے ”نیا دور“ (ماہانہ) جاری کیا اور اس میں ان کے تنقیدی مضامین بھی چھپنے لگے، تو معلوم ہوا کہ وہ جتنی اچھی افسانہ نگار ہیں، اتنی ہی اچھی نقاد بھی ہیں۔ یہ پرچہ تقسیم ملک تک برابر شائع ہوتا رہا۔ اور جب وہ کراچی منتقل ہو گئیں تو وہاں سے شائع ہونے لگا۔ یہ ۱۹۵۲ء میں بند ہوا، جب صدر شاہین بسلسلہ ملازمت یورپ گئے۔

ان کے افسانوں کے دو مجموعے۔ اپنی نگریا (۱۹۵۵) اور حدیثِ دیگران (۱۹۶۳)۔  
 شائع شدہ موجود ہیں۔ امریکی (انگریزی) مصنف اسٹین بک کے ناول "دی پریل"  
 کا ترجمہ "دشہوار" کے عنوان سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے امریکی  
 افسانوں کا ایک مجموعہ بھی اردو میں مرتب کیا تھا۔ اپنے تنقیدی مضامین بھی  
 "معیار" کے عنوان سے جمع کیے تھے۔ نٹوان کا محبوب افسانہ نگار تھا۔ انہوں نے  
 اس کے بارے میں ایک کتاب ("نوری نہ ناری") بھی لکھی تھی، جس میں نٹو کے  
 افسانوں میں انسان کے تصور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ آخری دونوں کتابیں  
 غالباً آج تک شائع نہیں ہوئیں۔

ان کی وفات سے اردو نے ایسا مصنف کھویا، جسے مشرق اور مغرب کے افسانوی  
 فن پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی اور جس نے اردو افسانے کو منزلوں آگے بڑھایا۔

## شوکت سبز واری، سید شوکت علی

ان کے جدِ اعلیٰ مغلیہ عہد میں ایران کے شہر سبز واری سے (جو مشہد اور نیشاپور سے مغرب میں ہے) نقل مکان کر کے ہندستان آئے، اور یہاں ضلع بلند شہر (یوپی) کے قریب ایک پرانی بستی مرزا پور میں بس گئے۔ ۱۸۵۷ء میں اس علاقے کا امن و امان تہس نہس ہو گیا، تو سید شوکت علی کے دادا سید نیاز علی اور ان کے چھوٹے بھائی سید افضل علی کو اپنا وطنِ ثانی بھی ترک کرنا پڑا؛ سید نیاز علی کے دوسرے بھائی سید فضل علی اسی ہنگامے میں انگریز کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔ اس قافلے نے پہلے چندے بلند شہر میں قیام کیا، اور بالآخر میرٹھ میں رختِ سفر کھول دیا۔

شوکت علی کے والد کا نام سید اسد علی تھا۔ گھر کی مالی حالت کمزور تھی۔ وہ کچھری میں کسی وکیل کے ہاں محرز تھے، اور اسی لیے عوام میں منشی اسد علی کے نام سے مشہور تھے۔ اولاد میں ان کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں، جن کے نام بہ ترتیب تاریخ ولادت یہ ہیں: جہمت علی، عزیز فاطمہ، یوسف علی، اسلام فاطمہ، شوکت علی، بلقیس فاطمہ، کلثوم فاطمہ، صالحہ خاتون۔ گویا شوکت علی سبھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے ان کی تاریخ ولادت ۱۹۰۸ء لکھی ہے، لیکن قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرٹھ میں ۱۹۰۵/۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ سید اسد علی نے خاصی طویل عمر پائی۔ وہ تقسیم ملک کے بعد تک زندہ رہے؛ ۲۹۹ سے یہ ضلع مرزا پور سے مختلف جگہ ہے۔



۱۹۵۲ء کو میرٹھ میں رحلت کی۔

اگرچہ زمانے کی روش کے مطابق خاندان میں اردو اور فارسی کا رواج تھا، اور ماحول بھی دینی تھا، لیکن گھر میں کوئی علمی یا ادبی روایت نہیں تھی۔ پیشے کے لحاظ سے یہ لوگ ملازمت اور سپہگری کو ترجیح دیتے تھے۔ لہذا جب سن شعور کو پہنچے، اور ان کی تعلیم کی منزل آئی، تو سید اسد علی نے بڑے بیٹے حشمت علی کو لے، وہی ہائی اسکول، میرٹھ صدر میں، اور پھر دوسرے یوسف علی کو بھی گورنمنٹ ہائی اسکول، میرٹھ شہر میں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کو بھیج دیا۔ بد قسمتی سے حشمت علی کا تعلیمی دور بہت مایوس کن ثابت ہوا۔ وہ پانچ چھ برس دسویں درجے کے امتحان میں بیٹھتے رہے، لیکن پوری کوشش کے باوجود ۲۱ برس کی عمر تک پاس نہ ہو سکے۔ بات یہ تھی کہ اگرچہ اور تمام مضامین میں ان کی قابلیت اپنے ساتھیوں سے کہیں زیادہ تھی، لیکن ریاضی میں وہ صفر تھے۔ اس مضمون سے انھیں مطلقاً سن نہ تھا اور اسی میں وہ بار بار فیل ہوتے رہے۔ شومی قسمت وہ انھیں دنوں عین عالم شباب میں رحلت کر گئے۔ کڑیل جوان بیٹے کی اچانک موت، سید اسد علی پر تو گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بچارے اس صدمے سے مختل الحواس سے ہو گئے۔ ایسے حالات میں انسان اکثر تو بہات کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ انھوں نے خیال کیا کہ ہوا نہ ہو، یہ مجھے بچوں کو انگریزی تعلیم دلوانے کی سزا ملی ہے۔ اس پر انھوں نے منجھلے بیٹے یوسف علی کو انگریزی اسکول سے اٹھا لیا۔

اس حادثے کا شوکت علی کی تعلیم پر بھی اثر پڑا، جو بڑے بھائی کی وفات کے وقت صرف آٹھ برس کے تھے۔ وہ خاصی بڑی عمر تک پڑھنے لکھنے سے محروم

رہے۔ سید یوسف علی بفضلہ زندہ و سلامت میرٹھ میں موجود ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵۔

۷۶ برس کی ہے (ولادت: ۱۸۹۹ء/۱۹۰۰ء)۔ پیرانہ سالی کا معمولی سا اثر زبان پر ہے۔

خفیف سی لکنت سے قطع نظر، صحت عام طور پر اچھی ہے۔

رہے۔ بالآخر انہیں قرآن پڑھنے کے لیے ایک استانی کے حوالے کر دیا گیا۔ انہیں اردو پڑھنے کا بھی شوق تھا، لیکن اس کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ اتفاق سے بہشتی زیور کا پہلا حصہ کہیں سے ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اپنی استانی سے درخواست کی کہ یہ مجھے پڑھا دیجیے، اور اردو لکھنا بھی سکھا دیجیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تمہیں یہ کتاب تو پڑھا دوں گی، لیکن لکھنا نہیں سکھاؤں گی۔ ان کے وجہ دریافت کرنے پر کھلا کہ استانی نے اپنے مرحوم خاوند کی ہدایت کے تحت ان کی زندگی ہی میں لکھنے سے اجتناب کرنے کی قسم کھائی تھی۔ غرض کتاب استانی نے پڑھا دی اور اٹکل سے انہوں نے دیکھ دیکھ کر حرف شناسی کے بعد اردو لکھنا خود سیکھ لیا۔ اس طرح انہوں نے قرآن ناظرہ ختم کر لیا، اور اردو میں بھی کچھ شد بد ہو گئی۔ اب والد نے ان کی آئندہ تعلیم کے بارے میں مسجد کے امام صاحب سے مشورہ کیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ تم نے دونوں بڑے ٹرکوں کو انگریزی پڑھائی تھی، اب بطور کفارہ اس لڑکے کو عربی پڑھاؤ، اس سے تمہاری سات پشتیں بخشی جائیں گی۔ اس پر شوکت علی میرٹھ کے مدرسہ امداد العلوم میں عربی فارسی کی تحصیل کے لیے بھیج دیے گئے۔

مدرسہ امداد العلوم، دارالعلوم دیوبند کی طرز کا مدرسہ آج بھی میرٹھ میں موجود ہے۔ اس زمانے میں اس کے صدر مدرس مولانا عبداللہ المومن دیوبندی مرحوم تھے۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (ف نومبر ۱۹۲۰ء) کے سارے تھے؛ حدیث اور فقہ میں ان کی دور دور شہرت تھی۔ دوسرے اساتذہ میں مولانا اختر شاہ عربی ادب اور فارسی ادب میں ممتاز تھے؛ وہ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ منطق اور فلسفہ کے استاد مولانا عبدالرحمن تھے۔ ان فاضل اساتذہ کی موجودگی کے باعث اس زمانے میں اس مدرسے کو بہت بلند مقام حاصل تھا۔

شوکت علی نے ان سب استادوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کا فارسی اور عربی کا ذوق بہت حد تک مولانا اختر شاہ کی صحبت کا رہا۔

منت تھا۔ اسی مدرسے سے انھوں نے ۱۹۲۲ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۲۳ء میں منشی فاضل کے امتحان پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے پاس کیے، جو اس زمانے میں ان علوم کا مرکز تھا۔ منشی فاضل کے امتحان میں وہ اس سال کے جملہ طلبہ میں اول آئے تھے۔

والد کی خواہش کا احترام اپنی جگہ، لیکن ان سے چوری چھپے، انھوں نے انگریزی پڑھنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا؛ اور یوں ۱۹۲۶ء میں انھوں نے انگریزی کے دسویں درجے کی سند بھی امتیازی نمبروں سے حاصل کر لی۔

یہاں غالباً ایک واقعے کا ذکر سبھل نہیں ہوگا :

شوکت صاحب نے مولوی فاضل کا امتحان دو مرتبہ پاس کیا۔ پہلی مرتبہ تو جیسا کہ اوپر لکھا، یہی ۱۹۲۲ء میں، دوسری مرتبہ اس سے دو تین برس بعد۔ ہوا یہ کہ مولوی عارف اللہ پیش امام مسجد جامع کے رشتے کے چچا حافظ احمد میاں، مولوی فاضل کا امتحان دینا چاہتے تھے۔ لیکن امتحان کی کافی تیاری نہیں تھی، یا کیا بات، وہ امتحان میں بیٹھنے سے گھبرار رہے تھے۔ شوکت صاحب نے ان سے کہا: آپ فکر نہ کریں، آپ کی جگہ میں امتحان میں بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ وہ احمد میاں کی جگہ امتحان میں شریک ہو گئے۔ لیکن کسی طرح بھانڈا پھوٹ گیا؛ ہر قسم امتحانات کو شبہ ہو گیا۔ تحقیق ہوئی اور یہ جعل سازی میں مانوڑ ہو گئے۔ مقدمہ چلا، اور سزا ہوئی، اور ان کی مولوی فاضل کی سند ضبط کر لی گئی۔ اس لیے انھیں دوبارہ امتحان پاس کر کے یہ سند حاصل کرنا پڑی۔

منشی فاضل کا امتحان پاس کر لینے کے بعد انھیں مدرسہ عالیہ، میرٹھ میں ۳۰ روپے مشاہرے پر فارسی اور اردو کے مدرس کی جگہ مل گئی تھی۔ یہاں ان دونوں زبانوں کے علاوہ اس زمانے میں قرآن کی کچھ ابتدائی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ وہ اس مدرسے میں ۱۹۳۰ء میں گئے تھے اور ۱۹۴۱ء تک یہیں رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پرائیویٹ طور پر انٹر سے لے کر ایم اے (فارسی) تک کے امتحان

پاس کیے۔ ایم اے (فارسی) کا امتحان انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۷ء میں دیا، اور وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں اول آئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے (عربی) کیا (۱۹۳۹ء-۱۹۴۱ء) میں انہوں نے مدرسہ عالیہ کی ملازمت کے دوران ہی میں میرٹھ کا لچ میں داخلہ لے لیا اور دو سال بعد یہاں سے قانون کی سند (ایل ایل بی) حاصل کی۔ اس دوران (یعنی ۱۹۴۲ء) میں وہ آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) سال اول کا امتحان پاس کر چکے تھے۔

جولائی ۱۹۴۳ء میں وہ اسلامیہ انٹر کالج، بریلی کے شعبہ فارسی و اردو سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۶ء تک رہے۔ اسی اثنا میں انہوں نے ایم اے (اردو) کے سال دوم کا امتحان دے کر سند حاصل کی۔ اس کالج میں تین برس تک کام کے بعد وہ میرٹھ کالج کے شعبہ اردو و فارسی میں آ گئے۔ میرٹھ آنے کا قصہ بھی دلچسپ اور قابل ذکر ہے۔

قیام بریلی کے زمانے میں انہوں نے "غالب کا فلسفہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کیا۔ مضمون ان کے اندازے سے طویل ہو گیا۔ وہاں کے ایک ناشر خلیل الرحمن مالک قومی کتب خانہ، بریلی ان کے ملنے والے تھے۔ ایک دن وہ حسب معمول آئے، تو یہ بیٹھے مضمون لکھ رہے تھے۔ انہوں نے دریافت کیا: کیا لکھا جا رہا ہے؟ تو کہا کہ غالب پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں، لیکن ختم ہونے میں نہیں آتا، پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس پر خلیل الرحمن بولے: پھیلتا ہے، تو پھیلنے دیجیے، اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے! یہ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اور سردی بڑے کڑا کے کی پڑ رہی تھی۔ اب خلیل الرحمن نے یہ معمول بنا لیا کہ ہر دوسرے تیسرے آتے اور شوکت صاحب کے کھانے کو درجنوں انڈوں کا ڈھیر سا راجا ساتھ لاتے۔ شوکت صاحب نے گویا یہ حلوا کھا کھا کر مضمون مکمل کیا، جو بڑھ کر کتاب بن گیا؛ اور اسے خلیل الرحمن نے "فلسفہ کلام غالب" کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا۔ یہ شوکت صاحب



کی پہلی کتاب تھی۔

شوکت صاحب نے یہ کتاب میرٹھ کے ایک متمول رئیس سیٹھ گوپی ناتھ کے نام معنوں کی تھی۔ اس میں بھی مطلبِ سعدی دیکر تھا۔ سیٹھ صاحب موصوف کانگریس کے سربراہ اور لیڈر اور میرٹھ کالج کی مجلس منتظمہ کے بااثر رکن تھے۔ اس کے بعد انھوں نے شوکت صاحب کو میرٹھ کالج میں ملازمت دلوا دی۔ یہاں وہ ۱۹۵۰ء تک رہے۔

اسلامیہ کالج، بریلی کی ملازمت کے زمانے میں ان کی وجاہت حسین عندلیب شادانی (ف جولائی ۱۹۶۹ء) سے خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ عندلیب شادانی ۱۹۲۸ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے پروفیسر تھے۔ شوکت سبزواری ہمیشہ قوم پرست رہے تھے اور سیاست میں ان کا میلان کانگریس کی حکمتِ عملی کے موافق تھا۔ اسی لیے وہ آزادی اور تقسیم ملک کے بعد ہندستان ہی میں مقیم رہے؛ اور درحقیقت ان کا ہجرت کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں شادانی نے انھیں ڈھاکہ آنے کی دعوت دی۔ ادھر تقسیم کے بعد کے زمانے میں یہاں اردو کے خلاف سرکاری اور غیر سرکاری رویہ بھی ہمدردانہ نہیں رہا تھا۔ اس سے شوکت مرحوم کو یہ خیال ہوا کہ دیر سویر میری نوکری جاتی رہے گی۔ اس اندیشے نے انھیں شادانی مرحوم کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کیا، اور وہ ڈھاکہ چلے گئے۔ وہاں وہ صدر شعبہ اردو مقرر ہو گئے۔ یہیں سے انھوں نے ۱۹۵۲ء میں اردو لسانیات میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری لی، جس کی تیاری وہ قیامِ میرٹھ کے زمانے سے کر رہے تھے۔ لسانیات کی طرف ان کا میلان بھی ایک حسنِ اتفاق کا کرشمہ تھا۔

ملک کی تقسیم اور آزادی کے قبل تک یہاں مذہبی مناظروں کا عام رواج تھا۔ ہندو، مسلمان، عیسائی ایک دوسرے کے خلاف بھی مناظرے اور شاسترا رٹھ کرتے رہتے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندرونی فرقوں میں بھی آئے



دن یہ مذہبی دنگل ہوتے رہتے تھے۔ اس کے لیے لوگ بڑی بڑی تیاریاں کرتے، اور دور دور سے اپنے ہتھیال عالموں اور ودوانوں کو بلاتے تھے۔ جس زمانے میں شوکت مرحوم مدرسہ عالیہ میں ملازم تھے، ایک دن چند آریہ سماجی صدر مدرس مولانا عبدالمومن صاحب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ہماری ایک "مجلس مباحثہ" ہے، جہاں ہم مسلمانوں اور عیسائیوں کو مناظرے اور بحث مباحثے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کسی مسلمان عالم کو مناظرے کے لیے بھیج دیں۔ مولانا عبدالمومن نے یہ دعوت قبول نہ کی؛ اور ان اصحاب سے کہا کہ یہ مناظرے بیسود ہیں، اور تفسیح اوقات سے زیادہ نہیں۔ اس پر ان میں سے کسی نے کہا کہ اتنا بڑا شہر اور اتنے سارے مدرسے؛ ہم یہاں کے سب مدرسوں میں گئے، جہاں اسلامیات کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن تعجب ہے کہ کسی نے ہمارا چیلنج قبول نہیں کیا، آخر کیا بات ہے کہ کسی کو ہمارے مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں ہوئی؛ شوکت صاحب بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے اس آریہ سماجی کی یہ بات سنی، تو غیرت آئی؛ جواب میں ان صاحب نے کہا کہ میں چلونگا۔ مولانا عبدالمومن بھی ان کا جوش دیکھ کر خاموش ہو رہے۔ اس پر ان صاحب نے پوچھا کہ آپ کس موضوع پر بحث کرنا پسند کریں گے؛ اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا، جس پر ہندی میں چند موضوعات کے عنوان لکھے تھے۔ شوکت صاحب کی ہندی سے واقفیت برائے نام تھی، اس لیے وہ پرچہ پڑھنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے اپنی لاعلمی پر یوں پردہ ڈالا کہ آپ جو موضوع چاہیں، میرے نام لکھ دیں، مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اس پر ان لوگوں نے مناظرے کے لیے "روح اور مادے کی قدامت" کے عنوان کا انتخاب کیا۔

اس مباحثے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ جب تک ہندی اور سنسکرت کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا جائے، اس

میدان میں کماحقہ کامیابی محال ہے۔ اس پر انہوں نے ایک پنڈت صاحب سے ٹیوشن کے ذریعے سنسکرت سبقاً سبقاً پڑھی، اور ہندی مفکرین کی کتابیں اور مذہبی متون ان کی اصلی زبان میں مطالعہ کیے۔ عربی اور فارسی وہ پہلے سے جانتے تھے، سنسکرت کے علم نے انہیں ان زبانوں کے تقابلی مطالعے کی قابلیت عطا کر دی۔

۱۹۵۹ء میں مختلف اصحاب (جوش ملیح آبادی، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی وغیرہ) کی تحریک پر حکومت پاکستان نے اردو کا ایک مکمل تاریخی لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کے سامنے آکسفورڈ ڈکشنری کا نمونہ تھا۔ اس کے لیے حکومت نے کراچی میں اردو ترقی بورڈ کی تشکیل کی اور لغت کی ترتیب و تدوین کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ اسی زمانے میں شوکت صاحب اولاً ڈھاکے سے ایک سال کی چھٹی لے کر کراچی آئے اور بطور ماہر اس بورڈ سے وابستہ ہو گئے۔ پھر شعبہ لغت کے مدیر اعلیٰ مولوی عبدالحق بنائے گئے اور ان کی مدد کے لیے تین مدیر مقرر ہوئے: سید ہاشمی فرید آبادی (ف جولائی ۱۹۶۴ء) ڈاکٹر شہید اللہ (ف جولائی ۱۹۶۹ء) اور ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ اس پر وہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے استعفیٰ ہو گئے۔ لیکن یہ انتظام بھی دو تین برس سے زیادہ قائم نہ رہا۔ اول ڈاکٹر شہید اللہ بنگلہ اکاڈمی، ڈھاکہ کے صدر بن کر گئے۔ پھر سید ہاشمی فرید آبادی کو کچھ حکومت وقت سے اور کچھ مولوی عبدالحق سے شکایات پیدا ہو گئیں، اور وہ کراچی سے لاہور چلے گئے۔ اگست ۱۹۶۱ء میں خود مولوی عبدالحق بھی جنت سدھارے۔ اب سارے کام کی ذمہ داری شوکت صاحب کے کندھوں پر آ پڑی۔ وہ مدیر اعلیٰ بنا دیے گئے، اور آخر تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔ بیشک، ان کے ساتھ عملہ تھا اور ان میں سے بعض اہل زبان اور زبان آور بھی تھے، لیکن واقع یہ ہے کہ اشتقاق اور تخریج کا کام شوکت سبزواری کے سواے اور کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ الفاظ کی تشریح

اور تحقیق میں وہ ایسی ہندی کی چندی نکالتے تھے کہ ان کے سب ہمکاران کا لوہا مانتے تھے۔ انسوس کہ ان کی وفات سے قبل اس لغت کی ایک جلد بھی منظر عام پر نہ آسکی۔ بہر حال آٹھ جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔ ان کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے۔

شوکت سبزواری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری اور شعر گوئی سے کیا تھا۔ انھوں نے ہمایوں تخلص اختیار کیا تھا۔ اس زمانے کے پرچوں میں ان کا کلام دستیاب ہو جاتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ لاہور، کے ماہنامے ”ادبی دنیا“ میں چھپا تھا۔ اسی رسالے میں ان کے بعض عربی مضامین اور افسانوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے تھے۔ لیکن بعد کو انھوں نے ”نگار“ اور ”معارف“ میں لکھنا شروع کر دیا، اور ”ادبی دنیا“ سے تعلق منقطع ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء میں جب ان کی پہلی سنجیدہ تصنیف ”فلسفہ کلام غالب“ شائع ہوئی، تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، اور انھیں نکتہ آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا کیسا ملکہ حاصل ہے۔ اس کے مدتوں بعد ”اردو زبان کا ارتقا“ شائع ہوئی (دھاکہ ۱۹۵۶ء)۔ یہ دراصل ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، جس میں انھوں نے اردو زبان کے آغاز اور اس پر دوسری زبانوں کے اثرات کی تاریخ بیان کی ہے۔ ان کی تین کتابیں لسانیات سے متعلق ہیں، ”داستان زبان اردو“ (دلی ۱۹۶۱ء)، ”لسانی مسائل“، ”اردو لسانیات“ آخر الذکر دونوں مضامین کے مجموعے ہیں۔ ”اردو لسانیات“ پر انھیں ۱۹۶۶ء میں ”داؤد ادبی انعام“ (پانچ ہزار روپے) دیا گیا تھا۔ ایک اور کتاب ”غالب: فکرو فن“ بھی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے تھے، انھیں دو جلدوں، ”معیار ادب“ (کراچی ۱۹۶۱ء) اور ”نئی پرانی قدریں“ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ہنوز بہت مضمون منتشر حالت میں پڑے ہیں۔

ان کا ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء صبح کے وقت کراچی میں انتقال ہوا؛ تدفین اسی شام عمل میں

آئی۔ تاریخ ہوئی: "فراق شوکت سبزواری" قبرستان "الطاف نگر" میں دفن ہوئے۔

شوکت صاحب کی شادی ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سید مبارک علی کی بڑی صاحبزادی ہاجرہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی رشتے میں ان کے ماموں ہوتے تھے۔ یہ اس طرح کہ وہ شوکت صاحب کی والدہ (علیم النساء بیگم) کے حقیقی ماموں ڈاکٹر سید بنیاد علی کے بیٹے تھے (شوکت صاحب کی نانی کا نام بنیاد بیگم تھا) ڈاکٹر سید مبارک علی بھی اپنے والد (ڈاکٹر سید بنیاد علی) کی طرح سالوتری تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے ہاپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں رحلت کی اور اپنے خاندانی قبرستان (نزد عید گاہ ہاپور) میں دفن ہوئے۔

ہاجرہ بیگم کے بطن سے ان کے دو بیٹیاں (حمیدہ اور ریحانہ) اور تین بیٹے (عارف اختر، ادر راشد، ظہر اور طارق انور) موجود ہیں۔ دونوں بچیوں کی شادی ہو چکی ہے، اور وہ اپنی اپنی جگہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بڑے صاحبزادے عارف اختر انگلستان میں (غالباً ایک کلو خانے میں ٹیکسٹائل انجینیر کے عہدے پر) کام کرتے ہیں۔ چھوٹے دونوں لڑکے پاکستان میں ہیں۔

شوکت صاحب نے اس بیگم کو اپنی ڈھاکے کی ملازمت کے زمانے میں طلاق دے دی، اور اس کے بعد انہیں کی چھوٹی بہن سلطانہ بیگم سے نکاح کر لیا تھا، لیکن وہ آخر تک ہاجرہ بیگم کے بھی کفیل رہے (بلکہ وہ رہتی بھی اسی گھر میں تھیں)۔ دوسری بیگم کی اولاد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

## ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر

۱۸ ستمبر ۱۹۱۶ء کو مراد آباد کے سربراہ اور وہ مخلوط سنی / شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کی ایک خاتون راجہ محمود آباد کے عقد نکاح میں آئیں، تو اس کے بعد کچھ لوگ اثنا عشری مسلک کے پیرو بن گئے۔ انہیں میں ڈاکٹر زاکر حسین کے دادا بھی تھے۔ انہوں نے مراد آباد کی سکونت ترک کر زکی اور لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا۔

ذاکر حسین کے والد زاکر حسین کا نکاح نواح بارہ بنکی (یوپی) میں موضع بشن پور کے شیخ ریاست علی خان کی بیٹی سے ہوا تھا۔ زاکر حسین اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی ولادت اپنی ناکھیاں بشن پور میں ہوئی، اور ان کی والدہ ان کی ولادت کے وقت انتقال کر گئی تھیں۔ زاکر حسین نے ۱۹۳۴ء میں رمویں درجہ کی سند لینے کے بعد کر سچین کالج، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا، اور سال بعد ۱۹۳۸ء میں یہاں سے بی اے کا امتحان پاس کیا، گھر کی مالی حالت کچھ بہت تسلی بخش نہیں تھی۔ تعلیم کا سارا زمانہ یوسف حسین صاحب پیر لکھنؤ نے ان کی سرپرستی کی، بلکہ یہ انہیں کی کوشٹھی میں رہتے تھے اور انہوں نے ہر طرح ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کی۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ والد بھی الٹا کو پیارے ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سنی، شیعہ اختلاف کا میدان بنا ہوا تھا۔ ایک طرف سے مدح صحابہ کے جلسے اور جلوس نکل رہے تھے، تو دوسری طرف سے بڑائیوں کے۔ زاکر حسین بہت اچھے مقرر تھے، خوش لہجہ



اور خوش بیان۔ اگرچہ تبرا سے کوسوں دور تھے، لیکن بہر حال شیعہ جلسوں میں انہیں بھی خطاب کرنا پڑتا تھا۔ جب فریقین کی سرگرمیوں کے باعث شہر میں نقص امن کا خطرہ پیدا ہو گیا، تو حکومت مداخلت پر مجبور ہو گئی۔ متعدد حضرات کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے؛ انہیں میں ذاکر حسین بھی تھے۔ کسی نے بروقت انہیں متنبہ کر دیا۔ یہ گھبرا کر بھاگ نکلے، اور بہی پہنچ کر دم لیا۔ اس کے بعد بہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اس تحریک اور ذاکر حسین کی اس میں شرکت کا ان کے لیے ذاتی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ فاروقی لکھنے لگے۔ اگرچہ ان کا خاندان فاروقی تھا، لیکن شیعیت اختیار کرنے کے بعد تقریباً سب نے یہ نسبت لکھنا ترک کر دی تھی۔ ذاکر حسین صاحب نے اس کی تجدید کی۔

بہی میں سب سے پہلی ملازمت اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول میں پڑھانے کی ملی۔ شاہرہ قلیل اور حوصلے بلند، کب تک یہاں پڑے رہتے! بارے، کچھ مدت بعد ڈیوڈ ساسون ہائی اسکول میں جگہ مل گئی، اور تنخواہ بھی زیادہ ملی۔ اس اسکول میں بہت دن رہے۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے:

ذاکر حسین بہی کارپوریشن کے انتخاب میں کھڑے ہوئے خود مسلمانوں نے ان کی مخالفت کی۔ وجہ؟ یہ یہودیوں کے اسکول میں ملازم ہیں۔ نتیجہ؟ یہ انتخاب ہار گئے اور ان کا مخالف جیت گیا۔

بہر حال انتخاب میں ہار جانے کی وجہ سے ان کی ملازمت پر کوئی آپخ نہیں آئی اور بظاہر وہ جب تک چاہتے، اس اسکول میں رہ سکتے تھے۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ ان کا محض بی، اے ہونا (اور ایم اے نہ ہونا) ان کی ترقی کے رستے میں حائل ہو رہا تھا۔ اس پر انہوں نے ۱۹۶۴ء میں پرائیوٹ طور پر ایم اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد وہ ہاراشٹر کالج آف آرٹس سائنس، بہی میں اردو، فارسی اور اسلامیات پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اب انہوں نے مشہور مرثیہ گو

شاعر میرزا سلامت علی دبیر کے حالات اور ان کے شاگردوں کے سلسلے میں مواد جمع کیا اور ایک مبسوط مقالہ لکھ کر بمبئی یونیورسٹی میں پیش کر دیا، جس پر اسٹیفنس ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی (پی ایچ ڈی) کی سند ملی۔ یہ وتیع مقالہ ”دبستان دبیر“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ (لکھنؤ ۱۹۶۶ء)

۱۹۶۶ء میں افریقا شیعہ فیڈریشن کے سابق صدر الحاج ابراہیم حسین شریف ونوجی نے ان سے فرمائش کی کہ آپ افریقا آئیں، اور ہمیں وہاں کے شیعہ مدارس کے لیے دینی نصاب مرتب کرنے میں مدد دیں۔ اس پر وہ چند ماہ کے لیے افریقا گئے اور یہ نصاب تیار کر دیا۔ یہ اردو اور گجراتی دونوں زبانوں میں چھپ چکا ہے۔ الحاج ابراہیم حسین شریف اور افریقا کے بعض اداروں نے ان کی جو خدمت کی تھی، اس سے ان کی مالی حالت بہت کچھ سدھر گئی، اور انہیں اس کے بعد کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اپنی وفات سے پہلے وہ ڈاکٹر آف لٹریچر ڈی لٹ ا کی سند کے لیے قصائد سے متعلق ایک مقالہ قلمبند کرنے میں مصروف تھے۔ اس میں قصیدے کی تاریخ، اور عربی، فارسی اور عربی اردو میں قصیدے کے ارتقا پر نظر ڈالنے کا ارادہ تھا۔ ہنوز اس کام سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء کی شب میں ڈھائی بجے (یعنی ۲۵ مارچ علی الصبح) خالق حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ جنازہ ۲۵ مارچ ہی کو دن کے دس بجے اٹھا اور انہیں شیعہوں کے مرکزی قبرستان رحمت آباد، میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

۱۹۴۵ء میں سر وزیر حسن کے سب سے چھوٹے بھائی سید شبیر حسن قلیل کی صاحبزادی جو رجمان (عرف تم رجمان بیگم) سے شادی ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔

انہوں نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے ہی میں اختیار کر لیا تھا۔ ان کا عنفوان شباب تھا کہ مولانا مجتبیٰ احسن کامونپوری (صدر شعبہ

دینیاتِ شیعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے لکھنؤ میں شیعہ سوسائٹی قائم کی۔ فاروقی صاحب نے ان کی فرمائش پر دینی موضوعات کے بارے میں کئی رسالے لکھے، اس سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئے۔ لکھنؤ میں ان کا متعدد اخباروں اور رسالوں سے بھی تعلق رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے سید شبیر حسن قاتل کے مشہور ہفتہ وار "قتیل" میں بھی کام کیا۔ ممبئی میں بھی یہ صحافتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ یہاں انھوں نے مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں بھی دلچسپی لینا شروع کی اور اس کے ہفتہ وار پرچے "پرداز" میں باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ ان کے علاوہ دو روزانہ اخباروں، "انقلاب" اور "ہندوستان" سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان میں ان کے مضامین بلکہ ادارے تک شائع ہوتے تھے۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

ادبِ لطیف (اردو ادب کی مختصر تاریخ)؛ دبستانِ آرزو (آرزو لکھنوی کے حالات)؛ سیما بکبر آبادی؛ سنیر شوہ آبادی؛ دبستانِ دبیر؛ (شبیبہ پیغمبر حضرت علی اکبر کے سوانح)؛ ہاشمی مجاہد؛ ربانی حکومت؛ فتحِ مبین؛ جمہوریت اور اسلام؛ مسلم لیگ کیوں؟

## گہر گورکھپوری، ایشوری پرشاد

مشرقی یوپی میں گورکھپور کٹی لحاظ سے اہم شہر ہے۔ اگرچہ یہاں اردو ادب سے دلچسپی لینے والے شروع سے رہے، لیکن ریاض خیر آبادی کے ۱۸۸۱ء میں ورود کے بعد شہر کی فضا شعرو شاعری کے لیے بہت سازگار ہو گئی۔ کائستھ حضرات، اسلامی دور حکومت کے شروع ہی سے، اردو اور فارسی میں پیش پیش تھے؛ ان کی گورکھپور اور اس کے نواح میں بھی اچھی خاصی آبادی ہے۔ وہ بھی علم و ادب کے اس ماحول میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گورکھپور کے شعرا میں اچھی خاصی تعداد کائستھ حضرات کی ہے۔

ان میں ایک صاحب حیثیت بزرگ منشی پراگ دت سر یو استوتھے۔ ان کی وسیع جاداد اور زمینداری تھی۔ انھیں کے بیٹے منشی منگل پرشاد عرف پھنی لال گہر کے والد تھے۔ گہر پانچ بھائی تھے؛ ایک بھائی ان سے بڑا تھا اور تین چھوٹے۔ گہر ۱۹۱۱ء میں اپنے جدی مکان محلہ قاضی پور خرد، گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گہر پر ہوئی۔ پھر میاں صاحب جارج اسلامیہ اسکول میں داخلہ لیا، جو اب انٹر کالج کے درجے کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن تعلیم

گورکھپور میں ایک خاصا بڑا امام باڑہ ہے، اور اس کے لیے ایک وقف ہے۔ اسے نواب آصف الدولہ نے تعمیر کرایا، اور اس دور کے ایک صاحب دل درویش روشن علی شاہ کو اس کا متولی مقرر کیا تھا۔ ان کے بعد سب متولی احتراماً میاں صاحب کے لقب سے مشہور ہوئے۔ موجودہ متولی (میاں جو علی شاہ) نے اسکول کے لیے زمین وقف کی تو اسکول کے نام میں "میاں صاحب کے اسکول" لکھا گیا۔

جاری نہ رہ سکی۔ آٹھویں درجے میں ناکام رہنے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ چونکہ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، اس لیے کسی نے اس کی پروا بھی نہ کی۔ انہوں نے البتہ اپنے طور پر اردو، فارسی کا مطالعہ جاری رکھا اور رفتہ رفتہ خاصی استعداد پیدا کر لی۔

۱۹۳۰ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا، تو اس میں ضامن علی جلال لکھنوی (ف ستمبر ۱۹۰۹ء) کے شاگرد عبدالمجید فہیم گورکھپوری (ف ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ بیفکری کا زمانہ، شعر و شباب اس پر مستزاد؛ اس نے انہیں کوچہ حسن میں پہنچا دیا، اور رہی سہی کسر شراب نوشی نے پوری کر دی۔ ساری عمر تجرّد میں بسر ہوئی۔

جہاں یہ اطوار ہوں، وہاں قارون کی دولت بھی کفالت نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بزرگوں سے جو کچھ درٹے میں ملا تھا، وہ جلد ہی ٹھکانے لگ گیا اور کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ ملنے والوں نے جب یہ حالت دیکھی، تو آنکھیں چرانے لگے۔ صحت بھی روز بروز گرنے لگی۔ ۱۹۴۴ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے سے بچ تو گئے، لیکن اس کے بعد پوری صحت ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ جگر، جو کثرت شراب نوشی سے تباہ ہو چکا تھا، جو اب دینے لگا۔ بہت بیمار ہو گئے۔ چند دن کس پیر سبی کے عالم میں گزرے۔ دوستوں کو خبر ملی، تو انہوں نے ڈسٹرکٹ اسپتال میں پہنچا دیا۔ وہیں ۱۵ جون ۱۹۷۳ء شام کے پانچ بجے، جان بحق ہو گئے۔ ارٹھی اگلے دن (۱۶ جون) قبل دوپہر نکلی، اور دریلے راپتی کے کنارے راج گھاٹ پر اسے نذر آتش کر دیا گیا۔

اگرچہ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن ہے یہ کہ وہ غزل کے شاعر تھے۔ دیوانِ اردو "سلکِ گہر" ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ (گورکھپور ۱۹۴۹ء) سلکِ گہر ہی کا کچھ منتخب کلام دیوناگری رسم الخط میں "مالا" کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔ اگرچہ ان کے کلام میں کوئی غلطی نہیں۔ غیبان



اور فن کے پہلو سے بھی اس میں کوئی مستقیم نہیں ہے، لیکن کوئی جدت یا خاص بات بھی نہیں؛ وہی روایتی انداز جو ازل سے ہمارے شعر کا طرہ امتیاز رہا ہے، ان کے ہاں بھی ملتا ہے۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

درِ دل کی بیقراری کچھ نہ پوچھو	جس نے بھی دیکھا مجھے، گھبرا گیا
اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے ہم، سامانِ زلیست	اس نے تو شیرازہ ہستی پر لیشاں کر دیا
ہے، چاہا جو کچھ، کیا اس نے	کچھ بھی میرا، گھرا کیا نہ ہوا
جس قدر سنتے گئے وہ داستانِ غم، گھرا!	دل مرا اتنا ہی مشتاقِ بیاں بنتا گیا
یوں آئیے میں رنگِ جنوں دیکھتے رہے	جیسے کہ مل رہے ہیں کسی اجنبی سے ہم
مٹی نہ تھی دنیا میں کہیں راحتِ ہستی	میخانے میں پہنچے ہیں، تو غم بھول گئے ہیں
جی کے بہلانے کو اکثر پی لیا کرتے ہیں ہم	کیا خبر تھی، سے ہماری زندگی ہو جائیگی
کیا جانے، کیا ملیگا تری بارگاہ سے	ہم کو خیالِ تنگیِ دامانِ ابھی سے ہے

## حشر سیتا پوری، سید محمد کاظم

سیتا پور کے محلہ قفیارہ کے قاضی سید محمد عسکری کے صاحبزادے تھے، جو ساری عمر سرکاری ملازم رہے اور سب جہتوں کے عہدے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ ان کا خاندان سادات رضوی سے تھا اور وہ حضرت امام رضا کی نسل سے تھے، لیکن کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ کبھی اپنے نام کے ساتھ رضوی کی نسبت نہیں لکھی۔

حشر صاحب تین بھائی تھے۔ سب سے بڑے سید محمد طاہر (انجن میاں) دیوانی کے مشہور وکیل تھے۔ وہ مدتوں سیتا پور بار ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ چھوٹے قاضی سید محمد تقی عارف سیتا پوری تھے۔ (ف ۱۹۷۱ء)

حشر ۱۸۹۵ء میں سیتا پور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق نجی تعلیم کے بعد، جو قرآن شریف اور اردو فارسی پر مشتمل تھی، سیتا پور کے سرکاری اسکول میں بھیج دیے گئے۔ دسویں کی سند لینے کے بعد لکھنؤ کے قدیمی کالج میں داخلہ لیا، اور یہاں سے بی اے پاس پاس کیا۔

اس زمانے میں ریاست محمود آباد کی علم دوستی کی شہرت تھی۔ راجہ سر محمد علی محمد خان والی محمود آباد خود بھی شعر کہتے تھے؛ سحر نخلص تھا۔ وہ شاعروں اور ادیبوں کے قدردان تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کے کسی شاعر مثلاً عزیز لکھنوی، ظریف لکھنوی،

سے بہت دن بعد خان بہادر مسعود حسن مسعود نے ان کی تاریخ ولادت کہی،

بافل کر دگار شدہ حشر در وجود  
بینم کہ در بہار جہاں نترن شکفت

سال ولادتش دل مسعود جست است  
این سال عیسوی است کہ بخت چمن شکفت

(۱۸۹۵ء)

ثاقب لکھنوی وغیرہ ان کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی حشر کو کالون کالج، محمود آباد میں ملازمت مل گئی۔ اگرچہ شعروہ اس سے پہلے ہی کہنے لگے تھے، لیکن دراصل ان کے ذوقِ سخن کی تربیت محمود آباد کے قیام، اور ان اساتذہ وقت کی صحبت کی، رہنمائی ہے۔ لیکن خود انھوں نے اپنے کلام پر احمد حسین (عرف عمدمیاں) ہاتف سینٹا پوری (ف ۹ جولائی ۱۹۲۷ء) سے اصلاح لی۔

جب راجہ سر محمد علی محمد خان مرحوم کو ان کے بارے میں علم ہوا، تو انھوں نے انھیں کالج سے بلوا کر تحصیلدار مقرر کر دیا۔ ان کی وفات (جولائی ۱۹۲۷ء) کے بعد ان کے صاحبزادے راجہ محمد امیر احمد خان (ف اکتوبر ۱۹۷۳ء) کے عہد میں بھی یہ ریاست کے ملازم رہے۔ ۱۹۵۲ء میں زمینداری کا خاتمہ ہوا، تو حشر صاحب محمود آباد کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ کے ایک فوجی دفتر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن یہاں بھد نہ سکی، اور مستعفی ہو کر سینٹا پور چلے آئے؛ اس کے بعد کچھ نہیں باہر نہیں گئے۔

اپنی طویل عمر میں بہت کچھ کہا، نوحہ، سلام، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، غزل۔ غرض کسی میدان میں بند نہیں تھے۔ بلکہ بعض تاریخی ڈرامے بھی لکھے۔ افسوس، مجموعہ کلام آج تک شائع نہیں ہو سکا؛ اور اب اس کے شائع ہونے کا امکان بھی کیا رہ گیا ہے!

طویل علالت کے بعد ۱ جون ۱۹۷۳ء کو رختِ سفر باندھا اور اپنے خالق کے پاس حاضر ہو گئے۔ سینٹا پور ریلوے اسٹیشن کے قریب کربلائے سلیم پور میں دفن ہوئے۔

اولادِ جسمانی میں تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ تینوں لڑکے برسرِ روزگار ہیں؛ بڑے گورکھ پور یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔

بہت مشکل سے چند شعر جناب وحی سینٹا پوری کی وساطت سے ملے ہیں، وہی حاضر ہیں؛

شبِ غم آنکھوں میں کٹ جاتی ہے تم نہ آتے ہو، نہ نیند آتی ہے  
 جو رکے ذکر پہ تم کیوں بگڑے! بات دنیا کی کہی جاتی ہے  
 حُسن کی آنکھوں میں آنسو بھرائے عشق کی بات رہی جاتی ہے

مرے حقے کے تھے سب درد و غم کیا! ستم ایجاد اب ترکہ ستم کیا!  
 شاعرِ حُسن ہے شہرت پسندی محبت کا کوئی رکھے بھرم کیا!

ایک آدا میں سو سونا ز حُسن ہے کتنا عشق نواز

مجھ کو سلسل تیری تلاش عشق کا ایک انجام آغاز

کوئی میخوار اس محفل سے پیسا سا جا نہیں سکتا

ہمیشہ سے غم ہستی کا گردش میں ہے پیمانہ

دُورِ غم میں بھی ہو لطفِ زندگی پیدا صلاحیت تو کرے خود میں آدمی پیدا

بڑے مزے سے گذر جائیگی فراق کی رات ترے خیال سے کر لی ہے دوستی پیدا

خضر کترا کے نکل جاتے ہیں زاہِ عشق سے ایک مدت ہو چکی ہے ان کو دنیا دیکھتے

ترا رازِ راز نہ رہ سکا، کسی طرح پردہ راز میں

وہ حقیقتوں کی تجلیاں نظر آئیں مجھ کو مجاز میں

اشکِ چشمِ خونِ نشاں کو کیا کروں! عشق کے اس رازِ دروں کو کیا کروں!

طے ہو رہے ہیں عشق کے پریچ راستے منزل پہ رفتہ رفتہ چلا جا رہا ہوں میں

کیا تکلم کا ترے انداز ہے ذرہ ذرہ گوشِ بر آواز ہے

یہ عالم ہوا دل کا ضبطِ فغاں سے کہ حرفِ طلب بھی نہ نکلا زباں سے

اسے جس طرح چاہے ہنس ہنس کے سنیے مراد کر میری زبانی نہیں ہے

دم ہے رُکا ہوں پہ ترے انتظار میں پھر آ خیالِ دوست کہ ٹھہرا ہوا ہوں میں

عشق سے قبل مجھ کو عطا دل ہوا درد سے پہلے درد آشنا مل گیا

بے معرفت تھی، مرا حُسن یقین تو دیکھ

سجدہ پہ کر رہا ہوں میں سجدہ ترے بغیر

دل کا کیا اعتبار الفت میں! آج اپنا ہے کل پرایا ہے  
 کچھ ایسا فرق تو، دوستی و دوستی میں نہیں حیات و موت کی حد آدمی کا اک دم ہے  
 نغمہ وحدت کا ہم آہنگ کتنا ساز ہے سیکڑوں پر دے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے  
 ہم کو تلقین ترکِ عشقِ فضول اپنا اچھا بُرا سمجھتے ہیں  
 لہنا سب کچھ مانتا ہوں میں تمہیں تم کو بھی تو کچھ سمجھنا چاہیے  
 ایک سو دن تھا کہ میں راہِ منزل تھا اب غبارِ رہِ منزل لیے جاتا ہے مجھے  
 حُسن کی ہر بات کا اس کو یقین عشقِ سادہ دیکھانہ میں نے سادہ دل  
 عزتِ نفس جس میں ہو برابر حشر! اس دوستی سے ڈرتا ہوں  
 حُسن کی دنیا عین کمال عشق کی دنیا عین یقین  
 کیا قیامت کر گئی محشر میں وہ نیچی نظر  
 ہم نے خود شکوہ کیا، اور خود پشمال ہو گئے



## جعفر حسن (جافر، حسن)، ڈاکٹر

کون ہے جس نے سرسید کے یارِ غار اور دستِ راست نواب محسن الملک کا نام نہیں سنا ہوگا! ان کا نام مہدی علی تھا اور وہ اٹا وہ کے رہنے والے تھے۔ وہ متوسط طبقے کے فرو تھے، لیکن ان کی قابلیت اور محنت، دیانت داری اور معاملہ فہمی اور فرض شناسی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب رسمی تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے ملازمت شروع کی ہے، تو صرف دس روپے مشاہرے پر (محرّ) بھرتی ہوئے تھے۔ اور جب ملازمت ختم کی اور پنشن پر سبکدوش ہوئے، تو اس وقت ان کا مشاہرہ دو ہزار روپے تھا اور ماہانہ پنشن ۸۰۰ روپے (حالی) مقرر ہوئی۔ وہ ۱۱۴ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شیکلے میں راہی ملک بقا ہوئے۔ لاش علی گڑھ لائی گئی اور سرسید کے پہلو میں سپردِ خاک ہوئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

مہدی علی جب ملازم ہو کر حیدرآباد (دکن) گئے، تو انھوں نے اپنے خاندان کے ہر اس شخص کو وہاں ملازمت دلوائی، جو حیدرآباد جانے پر تیار تھے۔ انہیں میں ان کے چھوٹے بھائی امیر حسن بھی تھے۔ امیر حسن رفتہ رفتہ اول تعلقدار کے عہدے تک پہنچے اور انھوں نے اسی عہدے سے ۱۹۱۴ء میں پنشن پائی۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے:

بہت دن کی بات ہے، جب میں نے حیاتِ مہدی مصنفہ امین زبیری میں خاندان کا حال پڑھا، تو دیکھا کہ معمول کے خلاف اس میں شجرے کا کوئی اندراج نہیں ہے، حال آں کہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان کا خاندان سید تھا۔ اس پر میں نے مہدی علی

محسن الملک کے بھتیجے (ڈاکٹر جعفر حسن) جعفر حسن سے دریافت کیا کہ زرا اپنے خاندان کے ہندستان آنے کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالیے اور بتائیے کہ حضرت علیؑ تک کتنی پشتیں ہیں۔ اس پر انھوں نے سرے سے اپنے خاندان کے سید ہونے کی تغلیط کی اور لکھا:

ہم لوگ سید نہیں۔ معلوم نہیں، کس نے اپنی مشیخت جتانے کو سیادت کا دعویٰ کیا۔ اسی لیے نہ کبھی میں نے، نہ ہادی حسن اور عابد حسن سفرانی نے اپنے نام کے ساتھ سید کا لفظ لکھا۔

نواب محسن الملک کا خاندان عقیدے کے لحاظ سے مخلوط تھا، ایک بھائی سنی، تو دوسرا شیعہ۔ سنی مردوں کی شادی شیعہ عورتوں سے، اور شیعہ مردوں کی شادی سنی عورتوں سے، ان کے ہاں کا عام دستور تھا۔ نواب محسن الملک جب سنی ہو گئے، تو انھوں نے اہل سنت کی تائید اور تشیع کے رد میں اپنی مشہور کتاب "آیات بینات" لکھی (۱۸۷۰ء) ان کے چھوٹے بھائی امیر حسن شیعہ تھے۔ انھوں نے "آیات بینات" کے جواب میں "آیات محکمت" تصنیف کی؛ لیکن دونوں کے درمیان تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔

امیر حسن مجلس کرتے اور مرثیہ بھی پڑھتے تھے۔ انھیں تحت لفظ پڑھنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ہر سال محرم میں تین چار اور صفر میں دو بڑی مجلسیں ان کا معمول تھا؛ اور ان میں خود ہی پڑھتے تھے۔ وحید کامرثیہ جس کی ایک ٹیپ کا شعر ہے:

جان یوں تن سے مرے، اے شہر خوشنویں نکلے

جس طرح، وقت سحر، پھول سے خوشبو نکلے

انھیں بہت پسند تھا؛ اور دوسرے تیسرے برس وہ یہ مرثیہ ضرور پڑھتے تھے، ۱۷ جون ۱۹۳۷ء کو حیدرآباد میں رحلت کی اور وہیں سپرد خاک ہوئے امیر حسن صاحب کی اولاد نرینہ میں چھ بیٹے تھے، ہادی حسن، بدرالحسن، جعفر حسن، ہادی حسن، ضیاء الحسن، عابد حسن۔ بدرالحسن کا اپنے زمانے میں

حیدرآباد کے آزاد خیال اور جمہوری تحریک کے لیڈروں میں شمار ہوتا تھا۔ افسوس ان کا عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔ ہادی حسن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے کامیاب پروفیسر رہے، بہت اچھے مقرر تھے، اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی۔ ان کا سٹی ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوا۔ عابد حسن (سفرانی) دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی ہندوستانی فوج میں رہے اور آزادی وطن کے بعد وزارتِ خارجہ میں لے لیے گئے تھے۔ وہ مختلف ممالک میں ہندستان کے سفیر رہنے کے بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں ملازمت سے پینشن پر سبکدوش ہوئے، آج کل حیدرآباد میں قیام ہے۔ ضیاء احسن کا بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا۔

جعفر حسن ۱۲ اگست ۱۹۰۴ء کو پربھنی میں پیدا ہوئے، جہاں ان دنوں ان کے والد امیر حسن صاحب اول تعلقدار کے عہدے پر فائز تھے۔ والد کے تبادلے کے ساتھ یہ بھی مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ چنانچہ ان کا بچپن راجپور، گلبرگر، پٹن چرو، ناندی پور وغیرہ میں بسر ہوا۔ ان کے والد کے ہاں بچوں کی انگریزی تعلیم کے لیے ایک اینگلو انڈین خاتون (سنز بوٹین) مستقل ملازم تھیں۔ وہ گھر ہی میں رہتی تھیں اور جہاں کہیں امیر حسن صاحب کا تبادلہ ہوتا، وہ بھی ساتھ جاتیں۔ اردو، فارسی، ریاضی، ناظرہ قرآن وغیرہ پڑھانے کے لیے، جہاں جاتے، وہاں کسی مقامی مولوی کا انتظام کر لیا جاتا۔ جعفر حسن صاحب کی تعلیم بھی اسی نہج پر ہوئی۔ جب دس برس کے ہوئے، تو انھیں ۱۹۱۴ء میں مدرسہ عالیہ، حیدرآباد میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں دسویں درجے کی سند حاصل کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی نئی نئی قائم ہوئی تھی اور حیدرآباد کے امرا کا طبقہ اسے کسی

سبب سے تذکرہ حیدرآباد کے مشہور میر عمارت سٹراپرک میزٹ ان سنز بوٹین کے بھانجے ہیں۔ حیدرآباد کی بعض عایشا اور قابل دید عمارتوں کے نقشے انھیں نے تیار کیے تھے۔ وہ آج کل انگلستان میں مقیم ہیں۔

قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا، بلکہ واقع یہ ہے کہ وہ اسے گھٹیا درجے کی درگاہ سمجھتے تھے۔ اس لیے جب جعفر حسن نے یہاں داخلہ لیا، تو خاندان کے بعض لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی؛ اور اس وقت تک دم نہیں لیا، جب دو سال بعد انہیں یورپ نہیں بھیج دیا گیا۔

نومبر ۱۹۲۲ء میں وہ جرمنی گئے؛ وہاں پانچ برس رہے۔ اس دوران میں انہوں نے ۱۹۲۵ء میں برلن یونیورسٹی سے جرمن زبان اور ادبیات کا ڈپلوما حاصل کیا اور دو سال بعد ۱۹۲۷ء میں جرمنی کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہائیڈل برگ سے سماجیات (سوشیالوجی) اور معاشیات (اکنامکس) میں ڈاکٹریٹ (ڈی فل) کی سند لی۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: ہندستان کا افلاس۔ یہ مقالہ انہوں نے جرمن زبان میں لکھا تھا اور یہ اسی زمانے میں چھپ گیا تھا (ہائیڈل برگ ۱۹۳۱ء)

ہندستان واپس آنے کے بعد وہ سب سے پہلے ۱۹۲۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں جرمن کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ طلبہ کو معاشیات اور سماجیات کا درس بھی دیتے تھے۔ دو سال بعد (۱۹۳۰ء) وہ جرمن اور سماجیات کے شعبے میں ریڈر بن گئے۔ ان ایام میں یہاں سماجیات کا شعبہ الگ نہیں تھا؛ یہ انہیں کی کوششوں سے ۱۹۴۵ء میں کھلا اور وہ صدر شعبہ مقرر ہوئے ۱۹۴۸ء میں ترقی ہوئی اور وہ پروفیسر بنا دیے گئے۔ ان کا ۳۳ برس تک عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلق رہا۔ اور ۱۹۴۱ء میں یہاں سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اردو سے ان کی دلچسپی طالعلمی کے زمانے کی دیر تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلیمی زمانے میں وحید الدین سلیم پانی پتی (ف ۱۹۲۸ء) ان کے اردو کے استاد تھے۔ سلیم کی تدریسی قابلیت اور علمی ذہانت اور جدت طرازی کے سب معترف ہیں۔ ان کی وضع اصطلاحات "جواب کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکی ہے، ایک عہد آفرین



تصنیف تھی۔ الیاس برنی (ف جنوری ۱۹۵۹ء) جعفر حسن کے معاشیات کے استاد تھے۔ انھوں نے اپنی دو کتابوں "علم المعیشت" اور "معیشت الہند" کے باعث بہت شہرت حاصل کی۔ وہ "ہندستانی مالیات" کے موضوع پر بھی ایک کتاب لکھ رہے تھے؛ لیکن ابھی یہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ادبیات کی طرف پھسل گئے اور اردو نظم کے انتخابات شائع کرنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے "جذباتِ فطرت" کے عنوان سے غالباً بارہ جلدیں شائع کی تھیں۔ لیکن وہ ادبیات ہی پر قانع نہ رہ سکے۔ اور آگے نکل گئے، تو مناظرانہ انداز کی مذہبیات تک پہنچ گئے۔ غرض انھوں نے اپنا اصلی میدان (معاشیات اور مالیات) چھوڑ کر بہت وقت ضائع کیا؛ اور اس سے اردو کا بہت نقصان ہوا۔ اگر وہ معاشیات اور مالیات ہی کے لیے وقف رہتے، تو خیال کیجیے کہ ان کی بدولت آج اردو کا دامن کتنا مالا مال ہوتا۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی بھی اس زمانے میں یہیں تھے (ف جولائی ۱۹۷۲ء) ان کا اردو سے عشق اور لسانیات سے شغف کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ غرض ایسے اساتذہ کی صحبت اور رہبری سے جعفر حسن کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ اردو انھوں نے گھر پر پڑھی تھی۔ "پھول" (ہفتہ وار) گھر پر آتا تھا اور ان کے مطالعے میں رہا تھا۔ ان اصحاب کے میل جول نے سونے میں سہاگے کا کام کیا اور انھیں اردو لکھنے کی ترغیب ہوئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ ڈاکٹر جعفر حسن یہاں استاد مقرر ہوئے، تو وہ بھی سماجیات کا سا جدید مضمون اردو میں پڑھانے پر مجبور تھے یہاں نئی نئی اصطلاحوں سے واسطہ پڑا، جن کے لیے اردو میں کوئی مترادف موجود نہیں تھا؛ یہ انھوں نے اپنی اہج اور زبانیت سے وضع کرنا شروع کیں۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ہمیں فارسی اور عربی کے بجائے ان اصطلاحات کی بنیاد ہندی اور سنسکرت پر رکھنا چاہیے، جو اردو کے خاندان کی زبانیں ہیں۔ ضمناً یہاں یہ



بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر جعفر حسن کی والدہ ماجدہ (فخرالحاجیہ) ایرانی نژاد تھیں، اس لیے فارسی گویا ان کی مادری زبان تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ مرہٹو اڑھ (پر بھنی) میں پیدا ہوئے، اور چونکہ ان کی زندگی کے ابتدائی ۱۴ سال وہیں گزرے، اس لیے وہ مرہٹی اور ہندی پہلے ہی جانتے تھے۔ لیکن اب ملازمت کے بعد انھوں نے ہندی کا فائر مطالعہ کیا اور اس سے انھیں واقعی بہت فائدہ ہوا۔ دو ڈھائی سال کی محنت اور مطالعے سے ہندی میں اتنی اچھی بہارت ہو گئی کہ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے ہندی شاعری پر منتخبات ہندی کلام، کے عنوان سے اپنی پہلی کتاب شائع کی۔ اس میں کبیر، تلسی، رحیم، میرا بائی وغیرہ کے دوہے دے کر سماجی نقطہ نظر سے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی (ف جنوری ۱۹۴۸ء) نے ہندوستانی پرچار سبھا قائم کی، تو ڈاکٹر جعفر حسین بھی اس کے ممبر بن گئے۔ ۱۹۴۵ء میں سبھا کی کل ہند کانفرنس، واردھا میں منعقد ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس میں شریک ہوئے اور یہاں انھوں نے ایک خصوصی نشست میں اپنا مقالہ ”ہندوستانی پرچار کے طریقے“ پڑھا۔ گاندھی جی نے یہ مقالہ دیکھا، تو وہ اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو سبھا کی اکاڈمک کمیٹی کا رکن مقرر کر دیا اور چندے بعد سبھا کی عاملہ میں لے لیا، اس کے صدر وہ خود تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کو مختلف حیثیتوں سے گاندھی جی سے ملنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کے کئی مواقع میسر آئے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، گاندھی جی اردو ہندی کا جھگڑا ختم کرنے کے لیے ہندوستانی کانفرنس ضروری خیال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جعفر حسن بھی ان کے مؤید تھے۔ افسوس کہ گاندھی جی کی اچانک اور افسوسناک موت نے انھیں اپنا کام مکمل کرنے کا موقع نہ دیا۔ لیکن ڈاکٹر جعفر حسن آخر تک انھیں اعمولوں کا پرچار کرتے رہے۔

ڈاکٹر جعفر حسن اردو اظہار میں بھی اصلاح کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ ہم جس طرح بولتے ہیں، اسی طرح لکھیں؛ اور جن حروف کی خاص آوازیں ہم ہندوستانی ادا کرنے سے قاصر ہیں، انہیں اپنے حروف تہجی کی نہرست سے نکال دیں (مثلاً ج، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع) اسی اصول کے تحت وہ ہمیشہ اپنا نام جعفر حسن کی جگہ "جافر ہسن" لکھتے اور اسی طرح دستخط کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں واوِ معدولہ کا رواج بھی ترک کر دیا تھا، اور بیتکلف خُد، خُش، خُشامد وغیرہ لکھتے تھے۔ اسی طرح "ث" اور "ص" کی جگہ صرف "س" لکھتے تھے۔ مثلاً اساسہ، مسروف۔ بلکہ اگر کوئی ان کی مانتا، تو وہ اردو کے لیے لائینی رسم الخط اختیار کر لینے کے خواہشمند تھے۔

گاندھی جی کا قبیح اور مؤید ہونے کا ایک اور اثر یہ ہوا کہ وہ بچے قوم پرست بن گئے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی اور عالمی برادری کے نظریے کے علمبردار تھے، وہ آخر تک کھڈر کا لباس اور گاندھی ٹوپی استعمال کرتے رہے۔ زندگی بھر شادی کا کھڑاگ پالا ہی نہیں۔ نے غم و زدوں نے غم کالا۔

انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ مطبوعہ کتابوں میں عمرانیات اور مسئلہ تعلیم۔ ہماری ریلیں اور ٹرکیں، زرعی افلاس، ہند، سماجیات (حیدرآباد ۱۹۳۸ء)، ابتدائی عمرانیات (حیدرآباد ۱۹۴۹ء)، اطلاقی سماجیات (علی گڑھ ۱۹۵۲ء)، ہندوستانی سماجیات (علی گڑھ ۱۹۵۵ء) زیادہ مشہور ہوئیں۔

کئی غیر مطبوعہ کتابوں کے سکل مسودے موجود ہیں؛ مثلاً (۱) سماجیات کی انگریزی، اردو مراد فاتی لغت (اس میں کوئی دس ہزار انگریزی لفظوں اور اصطلاحوں کے ہم معنی لفظ۔ بیشتر اپنے وضع کردہ۔ دیے ہیں۔ اور پھر ایک آدھ فقرے میں اس کی تشریح کی ہے) (۲) تمدنیاتی اصطلاحوں کی تشریحی لغت (اس میں تقریباً دو ہزار انگریزی کی دھن کاج، راج، سماج، نفسیات وغیرہ اصطلاحوں کے لیے اردو اصطلاحیں وضع کی ہیں) (۳) انگریزی۔ ہندوستانی لغت (۴) سماجیات کے اصول۔ ان کے علاوہ کئی انگریزی کی مشہور تحریروں کے ترجمے غیر مطبوعہ رہ گئے۔

ان کے شیعہ پس منظر کا اثر دو کتابیں ہیں؛ کارنامہ انیس اور "غالب اور انیس"؛ ایک تقابلی مقابلہ" یہ بھی شائع نہ ہو سکیں۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن کو انیس سے بہت دلچسپی تھی اور وہ تحت لفظ مرثیہ خوب پڑھتے تھے۔ آخری زمانے میں وہ ایک "انیس کمیٹی" قائم کرنے کے بہت متمنی تھے، لیکن افسوس کہ لوگوں کی سردمہری کے باعث یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو گا کہ انھیں افسانوں اور لطیفوں سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے دنیا بھر کے ملکوں کے لطیف جمع کیے تھے اور لطیفے کی جگہ لفظ "مزاحیہ" لکھتے تھے۔ ہندوستانی مزاحیہ، سنساری مزاحیہ، جامع مزاحیہ، لطیفوں کے مجموعے ہیں۔ "نئی نئی کہانیاں" اور "ان سنی کہانیاں" افسانوں کے مجموعے ہیں۔ کہانیاں زیادہ ترجمان زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ بقیہ سننے سنانے لطیفے، حکایتیں، دلچسپ روایتیں ہیں۔ یہ سارا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ ان کے علاوہ ان کے مطبوعہ مضامین بھی کچھ کم نہیں ہیں، جو ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں۔

زندگی کے آخری دو سال انٹریوں کے کیسے سے بیمار رہے۔ اسی سے ۲۵ جون ۱۹۷۳ء شام کے سات بجے انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اٹھا، مولانا تقی حسن وفا نے نماز جنازہ پڑھائی اور درگاہ میر مومن، حیدرآباد میں سپرد خاک ہوئے۔

## حمید ناگپوری، عبد الحمید

نسلاً قریشی تھے۔ دراصل ان کا خاندان حیدرآباد دکن کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے بڑی بزرگ تلاش معاش میں ناگپور چلے آئے تھے۔ حمید ۱۹۰۷ء کو یہیں ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ رسول صاحب اپنا آبائی پیشہ تصافی کرتے اور اس سے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتے۔ لیکن حمید سات برس کے تھے کہ بد قسمتی سے ان کا انتقال ہو گیا۔ بارے شیخ رسول کے چچا زاد بھائی حاجی شیخ علی نے اس بے یار و مددگار خاندان کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لی۔ سن شعور کو پہنچے، تو والدہ نے انہیں پڑوس میں حکیم سید بہاؤ الدین قاری کے حوالے کر دیا، جو شیخ رسول مرحوم کے دوستوں میں سے تھے۔ ان سے اردو اور فارسی اور کچھ مذہبی کتابیں بھی پڑھیں۔ پھر چندے ایک اور بزرگ حکیم تاج محمد خان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم ٹھیک طور پر ہوئی نہیں۔ عبرتِ احوالی کا جو عالم تھا، اس کے باعث کسی باقاعدہ اسکول میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان اساتذہ سے جو کچھ حاصل ہو سکا، اسی پر اکتفا کرنا پڑا، اور وہ بھی کتنا ہوا ہوگا۔ غرض اس پہلو سے انہوں نے جو کچھ ترقی بھی کی، وہ ان کے اپنے زورِ بازوی کا ثمرہ تھی۔

ان کی پوری زندگی داستانِ غم ہے۔ ان سے چھوٹی ایک بہن تھیں۔ بڑی مشکلوں سے اس کی شادی کا مرحلہ طے ہوا تھا کہ وہ ایک سال بعد داغِ مفارقت دے گئیں۔ والدہ بیچاری جو پہلے ہی غموں کی ماری تھیں، بیٹی کی جوانا مرگی کا صدمہ برداشت

نہ کر سکیں، اور گھل گھل کر چند ہی دن میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان بچے بعد دیگرے حادثات سے حمید صاحب پر کیا بیت گئی ہوگی! لیکن قدرت نے اسی پر بس نہیں کی۔ رہی سہی کسر ایک ”جذباتی حادثے“ نے پوری کر دی۔ اسی زمانے میں کسی کی ”ننگہ اتفات“ ان پر پڑی۔ غریب نے خیال کیا کہ شاید زندگی بسر کرنے کو سہارا مل گیا ہے۔ لیکن وہ خاتون بھی چند دن بیمار رہ کر اچانک موت کا شکار ہو گئیں۔ اب گویا ان کی دنیا تاریک ہو گئی۔ دل میں سٹھان لی کہ ساری عمر تہجد میں گزار دوں گا۔ لیکن تا بکے! دوست احباب کے کہنے سننے پر ۳۲ سال کی عمر میں ایک جگہ اپنی پسند سے نکاح کیا۔ غمگسار اور دلدار بیوی جو ملی، تو اس کی رفاقت میں وہ گزشتہ مصائب کی تلخیاں بھوننے لگے۔ لیکن کارکنانِ تقنا و قدر کو یہ کبھی منظور نہ ہوا۔ شادی کے دوسرے ہی سال بیوی بھی (عائشہ ان کا نام تھا) خلد آشتیان ہو گئی۔ مدتوں اسی طرح بسر ہوئی۔ آخر بمشکل شیخ علی کے مسلسل اصرار پر وہ نکاحِ ثانی پر رضامند ہوئے۔ اس بیگم کے بطن سے ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ ایک بیٹا ہتھرتسلی میں داغ دے گیا؛ دوسرا (محمد ابراہیم) ایک نیم سرکاری دفتر میں ملازم ہے۔ لڑکیاں سب شادی شدہ اپنے گھر بار کی ہیں۔

ساری عمر ان کا ذریعہ معاش بس اتنا رہا کہ اس سے تھیم و جان کو بیکار رکھنے کا سامان پیدا ہو جاتا تھا۔ شروع میں گوشت کا آبائی کام کیا۔ پھر کوئلے کا کاروبار کرتے رہے؛ لکڑی کی ٹال بھی بنائی۔ اس سے جو آزد قہ مل گیا، صبر و شکر سے اس پر قانع رہے۔ لیکن ۱۹۶۴ء میں فالج کا حملہ ہوا اور وہ نقل و حرکت سے معذور ہو گئے۔ دکان کی دیکھ بھال کون کرتا! آخر ان کے احباب نے ہاتھ پائو مارے اور ہاراشٹر حکومت کو توجہ دلائی، جہاں سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پچاس روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا، جو تادم مرگ ملتتا رہا۔

فالج کا مستقل عارضہ تو تھا ہی، آخری چند ماہ میں اس پر سوزشیں بول کے موزی مرض کی مصیبت مستزاد ہو گئی۔ یکم جولائی ۱۹۷۳ء سے طبیعت بگڑنا شروع ہوئی۔



جمعہ ۴ جولائی ۱۹۷۳ء علی الصباح پانچ بجے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اسی دن بعد نماز جمعہ قبرستان مومن پورہ، ناگپور میں آخری خواہگاہ میں پہنچا دیے گئے۔

حمید صاحب نے طبیعت حساس پائی تھی۔ گھر کے جو حالات تھے، وہ تو ظاہر ہی ہیں۔ ان پر مصائب نے اکھیں پکا پھوٹا بنا دیا تھا۔ نالے شعر کی شکل اختیار کر گئے۔ وہ تقریباً ۲۰ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے۔ چندے منشی نواب خان نواب ہندی الہ آبادی سے مشورہ کیا تھا؛ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن قائم نہیں رہا۔ نواب ریلوے کے ڈاکخانے میں ملازم تھے۔ جب وہ تباہی پر ناگپور آئے، تو حمید ان کی خدمت میں جانے لگے۔ لیکن اس کے جلد بعد ہی وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ناگپور سے چلے گئے، اور اصلاح کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد اپنی خداداد ذہانت اور طبع موڑوں کی رہنمائی میں خود ہی اپنے کلام کی نوک پلک درست کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ سب نے ان کی بہارت سخن تسلیم کر لی۔ اس کا ادنی ثبوت یہ ہے کہ سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی (ف ۱۹۶۹ء) نے جو کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے، ان کے کلام کی یوں تعریف کی ہے:

ہمیشہ ہی ان کا جو کلام میں نے سنا، اسے محاسن لفظی و معنوی سے پر پایا۔ اسے لیے میری دبتگی حمید صاحب سے برصتی ہی چلی گئی چنانچہ اب تو یہ عالم ہے کہ جہاں شرکت مشاعرہ کے لیے جانے کا ارادہ کرتا ہوں، وہاں منتظرین مشاعرہ پر حمید صاحب کو بلانے کی شرط لگا دیتا ہوں۔ اور جب جاتا ہوں، تو میری آنکھیں انھیں تلاش کرتی ہیں۔

ان کے کلام کا مختصر انتخاب "حرف خاموش" کے عنوان سے اپنا "کتاب گھر"، کامٹی (مدھیہ پردیش) نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں غزلیں، نظمیں، قطعات وغیرہ ہر طرح کا کلام ہے۔ ہنوز بہت کلام مسودوں کی شکل میں پڑا ہے۔ ان کے اشعار پڑھ کر ہرگز یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ کسی کم تعلیم یافتہ شخص کا کلام ہے؛ ایک ایک

مصرع سے پختگی فن اور قدرتِ زبان کا ثبوت ملتا ہے۔

جہاں چھوڑا تھا تم نے وقتِ رخصت  
 وہیں ٹھہرا رہا میرا زمانہ  
 خرابِ زیست ہوں، لیکن تری خوشی کے سوا  
 ترے تیار، مجھے زندگی سے کیا لینا!  
 حمید! اصل میں اک غم کو ہے ثبات یہاں  
 جسے دوام نہیں، اس خوشی سے کیا لینا!  
 ان کی خاموشی بھی افسانہ در افسانہ بنی  
 ہم نے جو بات کہی، بات سے آگے نہ بڑھی  
 عشق ہر مرحلہ غم کی حد میں توڑ چکا  
 عقل اندیشہ حالات سے آگے نہ بڑھی  
 نگہ دوست میں توقیر نہیں اس کی، حمید!  
 وہ تمنا جو مناجات سے آگے نہ بڑھی  
 تری یاد اور شامِ غم کی اداسی  
 دیا جیسے جنگل میں کوئی جلانے  
 حسنِ خود دارِ ادھر، عشقِ خود آگاہِ ادھر  
 نہ خبر آتی ہے کوئی، نہ خبر جاتی ہے  
 غم کے اشکوں سے جلا پاتا ہے انساں کا ضمیر  
 زندگی درد و مصائب میں نکھر جاتی ہے  
 اُف، یہ عالم کہ ترانام بھی لیتا ہے کوئی  
 دل پہ افتاد سی افتاد گزر جاتی ہے!

رزمگاہِ حیات میں، جیت کہاں کی، ہار کیا!

چاہیے جرأتِ عمل، فکر و زیانِ کار کیا!

سوز و گدازِ عشق سے دل جو ہو لطف آشنا

جنتِ قربِ یار کیا، دوزخِ انتظار کیا!

صیاد کے ستم کا، احسانِ حمید! مانو  
 کبجِ قفس میں چھوٹے، تم فکرِ آشیاں سے

یہ طوفانِ بلا تقدیر سازِ اہل ہمت ہے

کوئی حق آشنا کہہ دے، سبکسارانِ ساحل سے

حمید! اس دور میں آسائشِ مستی کسے حاصل!

سکونِ زندگی ناپید ہے انسان کے دل سے

یہ مانا عبادت میں ہے لطفِ زاہدا  
 خطا کاریاں، پھر خطا کاریاں ہیں

شرابی نظر، اور پینہ میر جبین پر

مجبور نہ کر اپنی محبت کے یقیں پر

نہ وہ دورِ بادۂ شوق ہے، نہ وہ تلخیِ غمِ پار ہے  
 مرا حالِ زار نہ پوچھیے؛ نہ سکون ہے نہ قرار ہے  
 جو پیامِ دوست نہ لاسکے جو کلمی نہ دل کی کھلا سکے  
 وہ نسیم کوئی نسیم ہے، وہ بہار کوئی بہار ہے

دل میں ہے وہی حسرتِ اظہارِ محبت ہم نے یہ کہانی انہیں سو بار سنا دی  
 آگ یہ کیسی چمن میں؟ ہمصفیرو! دیکھنا بچیلوں کی زد میں کس کا آشیانہ آگیا  
 شبِ وعدہ تو کچھ رونق درو دیوار پر ہوتی نہیں معلوم آخر کیوں یہ ویرانی نہیں جاتی  
 نگاہِ آشنا سے شکوہ بیگانگی کیسا! محبت کی نظر بھی تم سے پہچانی نہیں جاتی  
 کیا عشق میں فطرت بھی بدل جاتی ہے دل کی  
 تکلیف میں آرام ہے، معلوم نہیں، کیوں!

### مہاتما گاندھی

مردِ حق آگاہ گاندھی، ملک و ملت کا وقار  
 جس کی پیشانی کی منت کش، کلاہِ افتخار  
 انقلابِ دہر کو ٹھوکر کا جس کی انتظار  
 جو سمندرِ وقت کا رخ موڑ دے، وہ شہسوار  
 دہد بے سے جس کے دشمن لرزہ براندام تھا  
 امن و آزادی کا دنیا کے لیے پیغام تھا  
 پیچ تھا جس کی نظر میں رنگ و خوں کا اتنیاز  
 جس کی فطرت تھی نزاعِ کفر و دین سے بے نیاز  
 صاحبِ علم و فراست، نیک طینت، پاکباز  
 نوعِ انسانی کو جس کی ذات پر تھا فخر و ناز  
 جس کا مذہب آدمیت کے سوا کچھ بھی نہ تھا  
 جس کے سینے میں محبت کے سوا کچھ بھی نہ تھا

کھول دے تقدیر کے بل جس کے ماتھے کی شکن  
 آنکھ سورج سے ملا سکتا تھا جس کا ہانکپن  
 سوزِ حریت سے جس کا ہر نفس تھا شعلہ زن  
 مسکراتی تھی لبوں پر جس کے نصرت کی کرن

جذبہٴ فکر و عمل سے جس کا دل بیدار تھا  
 وہ مجاہدِ جواہنسا کا علمبردار تھا

سڑگوں تھا جس کے قدموں پر فرنگی سامراج  
 رکھ دیا بھارت کے سر پر جس نے آزادی کا تاج  
 امن و آزادیِ عالم کو تھی جس کی احتیاج  
 پیش کرنا ہے ہمیں جس کو عقیدت کا خراج

مادرِ ہندوستان کی شان و عظمت کی قسم  
 امتیازِ قوم و ملت کو سٹا ڈالینگے ہم

## ضیا بدایونی، ضیا احمد، پروفیسر

یوپی کا تاریخی شہر بدایون کسی تفصیلی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ یہ صدیوں تک علم و فضل اور رشد و ہدایت کا مرکز رہا ہے اور اسے اسلامی عہد کی بید برگزیدہ شخصیتوں کی جنم بھوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں حضرت محمد بن ابوبکر صدیق کی نسل سے ایک صاحب علم بزرگ مولانا وجیہ الدین اپنے خاندان سمیت سنبھل سے بدایون آئے، اور یہاں مولوی ٹولہ میں بس گئے۔ انہیں اصلاف میں کمال احمد صاحب ہوئے ہیں، جن کی فارسی ادبیات اور خطاطی میں بہارت بدایوں کے اہل علم حلقوں میں آج بھی یاد کی جاتی ہے۔ ان کے تین بیٹے ہوئے: بڑے، شفیع احمد محو شاگرد امیر مینائی (ف اکتوبر ۱۶۱۹۰۰)؛ منجھلے، رفیع احمد عالی شاگرد تسلیم لکھنوی (ف سئی ۱۶۱۹۱۱) اور مطیع احمد خشاں شاگرد راشد علی ضیا و منیر۔ رفیع احمد عالی وکیل عدالت تھے؛ اس حیثیت سے مدتوں ضلع بدایون کی تحصیل گنور میں مقیم رہے۔ وہ اپنے والد کی طرح فارسی کے فاضل، اور اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا

۱۶۱۹۳۴ میں انتقال ہوا۔

رفیع احمد عالی کی اولاد میں تین بیٹیوں کے علاوہ تین بیٹے ہوئے: رضی احمد رضی اور ضیا احمد ضیا اور آفتاب احمد جوہر۔ رضی احمد پولیس کے محکمے میں انسپکٹر تھے۔ ان کے کلام کا ایک مختصر انتخاب ”لمعات“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (علی گڑھ) انہوں نے ۱۶۱۹۳۹ میں رحلت کی۔ چھوٹے سبھائی آفتاب احمد ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ بفضلہ خوش و خرم بدایوں میں قیام ہے۔



ضیا احمد بروز جمعہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ (۲۱ ستمبر ۱۸۹۴ء) کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ پہلے دن سے قوام کے کمزور اور منحنی تھے؛ اسی باعث اکثر بیمار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسے بیمار ہوئے کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ نانی نے منت مانی کہ سچہ ٹھیک ہو گیا، تو میں اسے عربی پڑھا کر عالم و خادم دین بناؤنگی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ کہ وہ بچہ جو ہر طرح کے علاج معلجے سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، اس دعا کے بعد ایک معمولی عطار کے ٹونکے سے تندرست ہو گیا۔

جب سن شعور کو پہنچے، تو نانی اماں کی منت کے احترام میں بدایوں کے مشہور مدرسے شمس العلوم میں بھیج دیے گئے، جہاں کا نصاب درس نظامی پر مشتمل تھا۔ انہوں نے یہاں مولانا محب احمد قادری، مولانا محمد ابراہیم قادری اور مولانا شاہ عبدالقادر (سجادہ نشین درگاہ قادریہ) سے عربی پڑھی۔ عربی کے علاوہ اس مدرسے میں فارسی اور قرآن کی تعلیم پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر اسکولوں نے حدیث کی سند اور اجازت مولانا سید یونس علی محدث بدایونی سے لی۔

شمس العلوم میں درس نظامی کی تکمیل تو ہو گئی؛ لیکن چونکہ وہ انگریزی سے بالکل نا بلد تھے، اس لیے ان کے والد نے اب انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول، بدایوں میں بھیج دیا۔ یہاں دسویں درجے تک تعلیم پانے کے بعد انہوں نے بریلی کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کی سند حاصل کی، اور طلائی تمغہ انعام میں پایا۔ اس کے بعد چندے ملازمت کی اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ اب انہوں نے ڈاکٹر زبیر احمد صدر رشتہ پڑھا۔ فارسی کی نگرانی میں "فارسی ادب در عہد اکبر" کے موضوع پر مقالہ مرتب کرنے کی تیاری شروع کی۔ لیکن ہنوز کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جگہ مل گئی اور یہ مقالے سے دست بردار ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔ دو برس بعد ۱۹۲۹ء میں وہ دلی کالج، دلی میں بھی کوئی سال بھر تک ملازم رہے۔ لیکن جلد ہی یہاں سے مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں مدرس (پچر) بن کر علی گڑھ واپس

چلے گئے۔ اصحابِ حل و عقد نے محسوس کیا کہ اپنی تعلیم کے پیش نظر یہ اردو کی بجائے فارسی کے شعبے کے لیے زیادہ موزوں رہیں گے، چنانچہ ان کا تبادلہ شعبہ فارسی میں ہو گیا۔ وہ یہاں ۱۹۵۹ء تک رہے۔ پہلے مدتوں ریڈر کی حیثیت سے کام کیا، ۱۹۵۹ء میں سبکدشی سے کچھ پہلے پروفیسر اور صدر شعبہ بنا دیے گئے تھے۔

ملازمت سے الگ ہونے پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انہیں ایگزٹو پروفیسر کے طور پر تحقیقی کام کے لیے وظیفہ دیا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ انجمن ترقی اردو (ہند) میں اردو لغت کی ترتیب و تدوین کے کام پر مقرر ہو گئے۔ سال بھر بعد یعنی ۱۹۶۴ء میں دہلی یونیورسٹی کے انہیں اسی کام پر اپنے ہاں بلا لیا۔ یہاں وہ ۱۹۷۱ء تک رہے چونکہ اب بیمار بہت رہنے لگے تھے، خاص طور پر فشارِ دم کا پرانا عارضہ عود کر آیا تھا، اس لیے وہ میعاد ختم ہونے پر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد کبھی ان کا زیادہ قیام دہلی میں اپنے بیٹے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے ساتھ رہا، اگرچہ علی گڑھ جاتے آتے رہتے تھے۔ علی گڑھ ہی میں تھے کہ ۴ جولائی ۱۹۷۳ء کو انہیں فشارِ دم کے شدید حملے سے چکر آیا۔ ڈاکٹر نے پورے آرام کا مشورہ دیا۔ جب حالت اور خراب ہو گئی، تو اگلے دن (۵ جولائی) غفلت اور نیم بہوشی کی حالت میں انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ تین دن تک یہی صورت حال رہی۔ ۸ جولائی ۱۹۷۳ء علی الصباح تین بجے روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاٰجِعُونَ۔ اسی دن دوپہر کے وقت تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور انہیں یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ گویا علم و فضل کا وقار، شرافت و وضعداری، انکساری و خرد نوازی دفن ہو گئیں جتنا ظہیر احمد کمالی کے قطعہ تاریخ و فوات کا مقطع ہے :

از سرِ اندوہ تربت پر لکھوں سالِ وفات

تاجدارِ علم و حکمت، بادشاہِ فکر و فن

(۱۹۷۳-۱۹۷۲)

(۱)

ان کا نکاح غالباً ۱۹۰۹ء میں بدایوں کے قدیم قاضیوں کے خاندان میں تاجی منظور حسین

دکن کی چھوٹی صاحبزادی شکیلد خاتون سے ہوا تھا۔ ان سے ایک بیٹی (بلقیس خاتون) اور پانچ بیٹے (حبیب احمد، رفیق احمد میکش، ظہیر احمد صدیقی، نصیر احمد صدیقی، معین احمد صدیقی) اپنی یادگار چھوڑے۔ سب بیٹے برسرِ روزگار اور خوش و خرم ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی دلی یونیورسٹی میں ریڈرا اور مدرسہ شعبہ اردو ہیں۔

ضیا صاحب نے شعر گوئی اپنے اسکول کے زمانے میں شروع کی۔ شروع میں غزل کی طرف زیادہ میلان رہا۔ لیکن اکبر الہ آبادی سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے مشورہ دیا کہ غزل گوئی، بیکاری کا مشغلہ ہے؛ اس سے بہتر ہے کہ مولانا شبلی نعمانی (ف نومبر ۱۹۱۲ء) کی طرح تاریخ اسلام کے مشہور اور سبق آموز واقعات کو نظم کیا جائے۔ چنانچہ ان کا اس سے بعد کا کلام بیشتر اسی رنگ کی منظومات پر مشتمل ہے۔

باقاعدہ تلمذ کا تعلق کسی سے نہیں رہا۔ کبھی ضرورت پڑی، تو اپنے بڑے بھائی رضی بدایونی سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔

حسب ذیل تصنیفات ان سے یادگار ہیں:

- (۱) تصانیف مومن مع شرح (لکھنؤ ۱۹۲۵ء)؛ (۲) دیوان مومن مع شرح (الہ آباد ۱۹۳۳ء)
- بعد کو اس کے دو اور ایڈیشن شائع ہوئے (۱۹۴۷ء، ۱۹۵۷ء)؛ (۳) تذکار سلف (تاریخی منظومات کا انتخاب)؛ (۴) کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ (علی گڑھ ۱۹۴۸ء)؛
- (۵) تجلیات (مجموعہ نظم) (دلی ۱۹۵۳ء)؛ (۶) یادگار عالی (بدایوں) اس میں اپنے والد مرحوم کا کلام مع مقدمہ شائع کیا ہے؛ (۷) لمعات (علی گڑھ) اس میں اپنے برادر اکبر رضی بدایونی کا کلام جمع کیا ہے؛ (۸) قولِ رسد (علی گڑھ ۱۹۴۰ء) یہ محمود احمد عباسی امرہوی کی کتاب "خلافت معاویہ ویزید" کا جواب ہے؛ (۹) مکتوبات (دلی ۱۹۴۷ء) ان خطوط کا انتخاب جو دوسرے حضرات نے ان کے نام لکھے تھے؛ (۱۰) سمن زار (سہ ماہیہ اکاڈمی، نئی دلی ۱۹۴۸ء) فارسی شاعری کا انتخاب مع اردو ترجمہ؛ (۱۱) مباحث و رسائل (دلی ۱۹۷۱ء) علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ؛ اس پر یوپی اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپے کا انعام دیا تھا؛ (۱۲) جلوہ حقیقت (دلی ۱۹۷۲ء) مذہبی مضامین کا مجموعہ؛

(۱۳) مسالک و منازل (دئی ۱۹۷۵ء)؛ فارسی مقالات ادبی و انتقادی۔ کچھ حیزیں، خاص کر دیوان کا بیشتر حصہ، غیر مطبوعہ رہ گیا۔  
پورے کلام کا مجموعہ نہیں چھپا۔ ضخیم کلیات یا دگار چھوڑا ہے۔ زمانے کی روش بدل گئی، اب اس کے چھپنے کی کیا توقع ہے! اسی سے مختلف اصناف سخن کا انتخاب پیش کر رہا ہوں۔

### اسلام اور غلامی

کوفہ علیؑ کے نطل ہمایوں سے فیضیاب  
وہ شہریار، فرش زمیں جس کا رختِ خواب  
جس کی حسام شورش پہجا میں فتحیاب  
کہتے تھے بو تراب، رسولِ فلک جناب  
قبرِ غلامِ خاص تھے حیدر کے ہمراہ  
دو کپڑے اس جگہ کیے مولانے انتخاب  
اور دوسرا تھا نرخ میں کم آرزو خراب  
ہر دم تھا بسکہ پیش نظر جا وہ صواب  
بہر نماز عید کریں زیب تن جناب  
بولے کمالِ لطف و کرم سے یہ بو تراب  
میں پیر ہوں، بجا ہے تجل سے اجتناب  
مطلب یہ تھا کہ آئے نہ اس سے انہیں جناب

اس عہدِ معدلت کا یہ قصہ ہے جب کہ تھا  
وہ بادشاہ، نانِ جو میں جس کا ناشتا  
جس کی زبان محفلِ حکمت میں درفشان  
حاصل تھا یہ اسی کو تقرب کہ، پیار سے  
بازار ایک روز گئے، عید کے قریب،  
دونوں کے پیر سن تھے ز بس کہنہ دردی  
ایک ان میں نسبتہ تھا نفیس اور قیمتی  
اچھا جو تھا، وہ ان کو دیا، خود برالیا  
قبر نے عرض کی کہ جو بہتر لباس ہے  
اصرار اتہا سے بڑھا جب زفیق کا  
تم ہوا بھی جواں ہے تجل روا تمہیں  
چھیڑا نہ خواجگی و غلامی کا تذکرہ

محسنِ اسلام

(گاندھی جی)

آزادی ضمیر پہ قربان کر دیا  
ہندوستان میں امن سامان کر دیا  
دشواری حیات کو آسان کر دیا

اے وہ کہ تو نے جاں سی متاعِ عزیز کو  
اے وہ کہ تیرے خون کی ہر ایک بوند نے  
اے وہ کہ تو نے معشرِ اسلام کے لیے



تیرے ہر ایک قطرہ خون نے جہان میں  
تھی تیرے دم سے پیکر مہر و وفا میں جان  
حصنِ ودا دہندو مسلم تھی تیری ذات  
کیا نشہ شرابِ تعصب تھا جس نے، آہ  
ہے چست حریت کی قبا تن پہ ہند کے  
بھارت کو تھی دنوں سے بلیدان کی طلب  
”مسلم کو بھی ہے جینے کا حق خاکِ ہند میں“  
پھونکوں سے شمع دیں کو بجھانے چلے تھے جو  
چھایا تھا سجدوں کی فضا پر جو ابرِ جوہر  
بھولینگے اب نہ اہلِ وفا جس کو حشر تک

زیبا ہے تجھ کو ”محسنِ اسلام“ کا لقب

حق نے یہ مرتبہ تجھے پہچان کر دیا

مرحوم کو تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ بمحل نہیں ہوگا، اگر ان میں سے چند محفوظ  
کردی جائیں؟

تاریخ وفات سید نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی:

نعیب گلشنِ فردوس میں قیام ہوا

تو فکر سال کا منظور ہستام ہوا

کہ ملکِ علم و ادب، حیف بے نظام ہوا

گئے خرابہ ہستی سے حضرت دلگیر

جو گوشزد ہوا یہ حالِ غمِ مال، ضیا!

کہا زردے حملیوں خرد نے سالِ وفا

(۱۳۵۰ + ۱۳۵۳)

۳)

بوفاتِ فاضلِ مبرور، شاعر مشہور حضرت احسن مارہروی مغفور:

خدمتِ شعر و ادب تھا جن کا کام

ترپیکا سینے میں قلبِ شہام

وہ جنابِ احسن مارہروی

یاد آئینگی جب ان کی صحبتیں

ہر ایک تاریخ کے ساتھ خاصا طویل قطعہ ہے؛ میں نے صرف چند اشعار انتخاب کر لیے ہیں۔



رض ہے حق سے کہ ان کی قبر پر  
بارش بارانِ رحمت ہو مدام  
ہے ضیا! گر فکرِ تاریخِ وفات  
لکھ: "وصالِ شاعرِ شیریں کلام"

(۱۳۵۹)

تاریخِ رحلتِ حضرت اخی وابتنازی مولوی حاجی رضی احمد صاحب رضی:

بے حادثہ سخت بڑے بھائی کی رحلت  
تفصیل کا یارا ہے زباں میں، نہ قلم میں  
یاد آتے ہیں جب ان کے وہ لطافِ فراواں  
بندھ جاتی ہے اشکوں کی جھڑنی جوشِ الم میں  
مجھ کو بھی نینِ شعر میں خامی کا ہے رونا  
حالی کی طرح حضرت استاد کے غم میں  
تاریخ بھی رحلت کی، ضیا! ہے یہ دعا بھی  
"ہمان ہوں" وہ دارِ چستانِ ارم میں

(۱۳۵۸)

جسوی و مجسبی فاضل نبیل مولوی یعقوب بخش راغب بدایونی:

وہ راغب، وہ عزیزِ مصر معنی  
نہیں جن کا بدل ہندوستان میں  
ضیا! کہ مصرعِ تاریخِ رحلت  
یہ فرمائش تھی بزمِ دوستان میں  
جو نکلا مادہ میں نے سنایا  
"گئے راغب گلستانِ جناں میں"

(۱۹۹۸-۵۰ = ۲۸۰ = ۶۱۹)

۵۰

جناب مولانا عبد القدیر قادری بدایونی:

عالمِ دین، حضرت عبد القدیر  
زی الفضائل ذی کرم، ذی مرتبت  
آہِ رحمت ہو گئے شوال میں  
اس جہاں سے سوتے دارِ آخرت  
ہے دعا، ہا رب! ہوان کے زبیرِ فرق  
تاجِ گلہا سے ریاضِ مغفرت  
کر تلمِ تاریخِ اس غم کی، ضیا!  
"انتقالِ عالمِ نیکو صفت"

(۱۳۷۹)

تاریخِ وفات ڈاکٹر ہادی حسن:

فاضلِ شیریں بیاں ہادی حسن  
ناگہاں دوش از قضا خاموش شد  
یود و دانش شمعِ ایوانِ کمال  
حیف! از بادِ فنا خاموش شد

گفتش سال از سرِ حزنِ عالم      "طوطی گویاٹے ما خاموش شد  
( ۸ + ۱ )  
۱۳۷۳ھ = ۱۳۸۲ھ

غرض کتنی تاریخیں نقل کروں۔ ان کی بیاض میں بے مبالغہ سینکڑوں تاریخیں ہیں۔ دستوں کے ہاں ولادت، شادی، غمی کی، کسی کے تحفے کی رسید، کسی کی کتاب کی طباعت کی، ہر طرح کی تاریخیں ہیں۔ مرحوم مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے۔ ان میں دو تاریخیں میرے متعلق بھی ہیں؛ انہیں شامل انتخاب کر رہا ہوں تاکہ یادگار رہیں۔

۱۹۴۵ء میں ہماری چھوٹی بیٹی بشری کی شادی ہوئی، تو انھوں نے تاریخ کہی؛ تاریخ عقد بشری دختر مالک رام صاحب:

جبذا طوی ہمایونے کز آل      ہرغم است اندر ہجوم عیش گم  
بہر تاریخش خردنو شاہ را      گفت: "والد ہاذہ بشری لکم"  
(۱۳۸۵ھ)

۱۹۷۱ء میں میرے لیے اجباب نے تین جلد (اردو اور انگریزی) میں ایک اعزازی کتاب مرتب کی، جسے راشٹرپتی شری دی، وی، گری بالقابہ نے ایک خاص تقریب میں، جو راشٹرپتی بھون میں منعقد ہوئی تھی، مجھے پیش کیا۔ اس موقع پر مرحوم نے تاریخ کہی:

قطعہ تاریخ نگاہ داری "حشَن مالک رام" بخدمتِ فاضلِ موصوف؛  
زہے ہر سپہرِ سلیم مالک      نگہ دارد حق از بیم زوالش  
خجستہ "ارمغانے" کہ اینک آمد      دلیل تازہ براوج کمالش  
ہوا خواہاں ز بس دلشاد گشتند      بہ شریفی کہ دادہ ذوالجلالش  
بمن گفتم سر و ش "از روے الہام      "ہمایوں بخت روشن فکر" سالش  
( ۱ + )  
۱۹۷۰ء = ۱۹۷۱ء

اب آخر میں چند شعر غزل کے بھی ملاحظہ ہوں:

صدقے، اے عشقِ تصور! تری رنگینی کے      غلذ نظر رہے گوشہ مری تنہائی کا  
۷۱ اشارہ بہ کتاب "ارمغان مالک" (ضیا)

حُسنِ فطرت کا بہر رنگ نمایاں ہونا  
 کبھی سبز، تو کبھی گلِ خندان ہونا  
 حُسنِ پھر حُسن ہی ہے، لاکھ خطا وار سہی  
 مجھ سے دیکھا نہ گیا ان کا پشیمان ہونا  
 میں ہوں اندوہ ہے، اور گوشہ تنہائی ہے  
 وہ ہیں، اغیار ہیں، اور انجمن آرائی ہے  
 تمنا کا نسا ہونا، ہے برآنا تمنا کا  
 کہاں تھی دکھشی یہ جلوۂ حُسنِ خود آرائی  
 نہیں کم مرگِ حسرت کبھی حیاتِ تلخ کامی سے  
 جنوںِ سجدہ پیہم کا اعجاز، اے ضیا! دیکھو  
 انوارِ تجلی کی، اندر سے، نظر سوزی  
 یہ کشمکش، ہستی سرمایہ ہستی ہے  
 وہ سامنے ہیں پھر بھی محرومِ تجلی ہوں  
 ہے وہی طور، وہی برقِ تجلی، لیکن،  
 اب نہ وہ رنگ ہے غنچوں میں، نہ بو پھولوں میں  
 کھل ہی گیا سب رازِ دل ان کا  
 جان کی قیمت، عشق کی عظمت  
 کبھی سبز، تو کبھی گلِ خندان ہونا  
 مجھ سے دیکھا نہ گیا ان کا پشیمان ہونا  
 وہ ہیں، اغیار ہیں، اور انجمن آرائی ہے  
 مجھے مشکور سعی بے اثر معلوم ہوتی ہے  
 مری رنگینیِ ذوقِ نظر معلوم ہوتی ہے  
 وہ تھی دشوار، یہ دشوار تر معلوم ہوتی ہے  
 جبینِ شوقِ جزوِ سنگِ در معلوم ہوتی ہے  
 بے پردہ ہیں اور پردہ ہے چشمِ تماشے  
 موجوں نے کہا بڑھ کر یوں ساحلِ دریائے  
 تصویرِ تحریر ہوں، نیرنگِ تماشے  
 دشتِ امین میں نہیں موسیٰ عمراں کوئی  
 لے گیا ساتھ بہا رحیمپنتاں کوئی  
 چشمِ سخنِ آرا کی زبانی  
 میں نے نہ سمجھی، تم نے نہ جانی

## سجاد ظہیر، سید

ان کا خاندان ضلع جوہپور (یوپی) کے چھوٹے سے گاؤں کلاں پور کا رہنے والا تھا۔ یہ لوگ دراصل زمیندار تھے، اگرچہ انھوں نے ملازمت شروع کر دی تھی۔ چنانچہ سجاد ظہیر کے دادا سید ظہیر حسن صاحب تحصیلدار تھے، اور والد سید وزیر حسن اپنے زمانے کے کامیاب ترین وکلاء میں سے تھے۔ سید وزیر حسن نے شروع میں چندے پر تاپ گڑھ میں وکالت کی اور اس کے بعد لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ وہ ملکی سیاست میں بھی بہت سرگرم تھے، بہت دن تک آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری رہے۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ کا جو سیاسی سمجھوتہ لکھنؤ میں ہوا تھا، اس میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پہلے اودھو چیف کورٹ میں جج مقرر ہوئے اور بعد کو اس کے چیف جج بن گئے۔

سید وزیر حسن کا پڑوس کے دیہات بڑا گاؤں کے ایک اور زمیندار کی صاحبزادی سکینہ الفاطمہ بیگم (عرف سکین بی بی) سے نکاح ہوا تھا۔ ان کی اولاد میں پانچ صاحبزادے ہوئے، علی ظہیر، حسن ظہیر، حسین ظہیر، سجاد ظہیر، باقر ظہیر، بفضلہ تعالیٰ سب نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

سید سجاد ظہیر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عام طور پر ان کی تاریخ ولادت ۵ نومبر ۱۹۰۵ء لکھی گئی ہے۔ اس میں مہینا اور دن تو درست ہیں، لیکن سال ٹھیک نہیں؛ ۱۹۰۵ء کی جگہ ۱۹۰۴ء چاہیے۔ میں نے ایک دن خود ان ہی سے اس معلوم عوام تاریخ کی تصدیق چاہی، تو کہنے لگے کہ سرکاری کاغذوں میں یہی تاریخ لکھی ہے؛ لیکن ہوا یہ کہ جس دن باپ (والد) مجھے اسکول میں داخل کرانے کو لے جا رہے

تھے، بوبو (والدہ) نے ان سے پوچھا: اس کی پیدائش کی تاریخ کیا لکھواؤ گے؟ بابا نے جواب دیا، جو ٹھیک تاریخ ہے، وہی لکھواؤنگا۔ اس پر بوبو نے کہا، ایک سال کم لکھوا دینا۔ بابا نے فرمایا: بہت اچھا، یہی کر دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے تاریخ ولادت ۵ نومبر ۱۹۰۴ء کی بجائے ۵ نومبر ۱۹۰۵ء درج کرادی؛ اور یہی شہور ہوگئی۔

سجاد ظہیر کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں اپنے بڑے بھائیوں کی طرح یہی آکسفورڈ بھیج دیے گئے۔ سید وزیر حسن چاہتے تھے کہ سجاد ظہیر آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے (آنرز) کی سند لیں اور انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے بڑے افسر بنیں اور یوں ان کے خیال میں، کامیاب زندگی بسر کریں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب ہوا، جس نے صدیوں کی زار شاہی کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس واقعے نے بین الاقوامی سیاست میں بلا مبالغہ زلزلے کا کام کیا۔ جہاں بادشاہوں اور سرمایہ داروں اور نوکر شاہی نے اسے اپنے اقتدار کے لیے فال بد خیال کیا، وہیں عوام نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ بیشتر ملکوں میں اس انقلاب کی یادگار کے طور پر اکتوبر کلب قائم ہوئے، جن میں نوجوان ترقی راجوں شامل ہونے لگے۔ ایسا ہی ایک کلب آکسفورڈ میں تھا۔ سجاد ظہیر بھی اس کے رکن بن گئے۔

سجاد ظہیر اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں شروع سے باغیانہ خیالات کے تھے۔ وہ جوہلی ہائی اسکول کے دسویں درجے میں پڑھتے تھے؛ یہی پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا، جب ۱۹۱۹ء میں ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ سجاد ظہیر پر ان کا بہت اثر ہوا۔ اگرچہ اپنے خاندانی ماحول کے پیش نظر ان سے بر ملا اپنی ہمدردی یا انگریزی مخالفت کا اظہار تو نہیں کر سکتے تھے، لیکن عنفوانِ شباب میں حکومت بیزاری کا جو جذبہ ان کے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا، وہ مرورِ زمانہ کے ساتھ نشوونما پاتا رہا، اور جب انہیں آکسفورڈ میں آزاد فضا میسر آئی، تو وہ



برگ و بارے آیا۔ آکسفورڈ کلب میں کس قسم کی گفتگو ہوگی، وہاں کون لوگ کیسی تقریریں کرتے ہونگے، اس سب کا آسانی سے تصور کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر میں سجا ڈھیر نے اپنے والد کی خدمت میں لکھ دیا کہ میں آئی، سی ایس نہیں بننا چاہتا۔ سید وزیر حسن صاحب نے اس پر بادل ناخواستہ رضا مندی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ اچھا پیرسٹری کا امتحان پاس کر لو۔ سجا ڈھیر پیرسٹری کے بھی تھی میں نہیں تھے، وہ اپنے مستقبل کا کچھ اور لائحہ عمل بنا چکے تھے، جس میں وکالت کی کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن اب انہوں نے دوبارہ والد کو لکھنا مناسب خیال نہ کیا۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۳۶ء میں وطن واپس آئے ہیں، تو بی، اے (آکسن) بھی تھے اور پیرسٹری بھی؛ لیکن اس کے ساتھ وہ بچے کیونٹ بھی تھے۔

ہندستان واپس آنے کے بعد انہوں نے ادبی اور سیاسی دونوں محاذوں پر کام شروع کیا۔ وہ اپنی تعلیم کے دوران (۱۹۳۱ء) میں کوئی چھ مہینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے یہاں سے افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے چھاپا۔ اس میں کل دس افسانے تھے، پانچ خود ان کے، دو احمد علی کے، ایک افسانہ اور ایک ڈرامہ رشید جہان کا، اور ایک محمود الظفر کا۔ ان سب افسانوں کا معیار کسی طرح بھی بلند نہیں کہا جاسکتا؛ یہ زبان اور بیان کی خامیوں سے بھی مبرا نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے ہماری افسانہ نگاری کو ایک طرح سے نیا رخ ملا۔ ان میں سماجی اور مذہبی مسائل پر جس بیباکی اور صاف گوئی، بلکہ کہیں کہیں عریانی سے اظہار خیال کیا گیا تھا، وہ ہمارے ادب میں بالکل نئی چیز تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ولایت میں لارنس، جوائس، فرانک ہیرس، فرائڈ وغیرہ کی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہی تھیں، جن کی تقلید میں انہوں نے یہ افسانے لکھے اور طبع کرائے۔ بہر حال ان کا یہ تجربہ بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ بیشتر حلقوں سے کتاب کی مخالفت میں آواز بلند ہوئی اور آخر حکومت وقت نے اسے ضبط کر لیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنا مختصر ناول "لندن کی ایک رات"

سبھی شائع کیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں یعنی ہندوستان واپس آنے سے کوئی سال بھر پہلے، انھوں نے لندن ہی میں ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرودین گپتا، محمدین تاثیر کے ساتھ مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس کے اغراض و مقاصد کا پہلا مسودہ جیوتی گھوش نے تیار کیا، پھر اس پر سب نے مل کر بحث کی اور نوک پلک درست کر کے اسے آخری شکل دے دی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ادب مقصدی ہونا چاہیے؛ اسے عوام کی زندگی اور تہذیبی روایات، خواہشات اور تمنائوں کا مظہر ہونا چاہیے؛ اور سب سے بڑھ کر اسے سرمایہ داری اور استحصال کا مخالف ہونا چاہیے، تاکہ لوگوں کی تربیت ہو سکے، اور وہ آزادی کی سی بیش بہا نعمت کی قدر پہچانیں اور اس کے حصول اور اس سے متمتع ہونے کی تیاری کر سکیں۔ اس میں اردو یا کسی زبان کی تخصیص نہیں تھی۔ چونکہ ہندوستان کی عرب زبانوں کا ادب بیک وقت ان مقاصد کی تکمیل اور ملک کو آزادی کی شاہراہ پر ڈالنے میں ممد و معاون ہو سکتا تھا، اس لیے انجمن کا یہ مقصد بھی تھا کہ ملک کی سب زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے اور ان کی تخلیقات کے دوسری ملکی زبانوں میں ترجمے شائع ہوں، جس سے ملک کی ادبی ترقی میں توازن اور یکجہتی پیدا ہو سکے۔

سجاد ظہیر نے لندن سے اس انجمن کے اغراض و مقاصد کی نقلیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنے دوستوں کو بھیج دی تھیں، اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اتے اپنے اپنے حلقے کے ادیبوں کو دکھا کر ان کی رائے معلوم کریں اور ہو سکے، تو ان کی تائید حاصل کر کے ان سے اس دستاویز پر دستخط کرائیں۔

سر وزیر حسن اودھ کورٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد لکھنؤ سے نقل مکان کر کے الہ آباد میں مقیم ہو گئے تھے، اور یہاں باقاعدہ وکالت کرنے لگے تھے۔ سجاد ظہیر ۱۹۳۶ء میں وطن واپس آئے، تو لا محالہ والدین کے پاس الہ آباد ہی میں رہنے لگے۔

اس وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا مرکزی دفتر نہرو خاندان کی ماہی شان عمارت آئندھون  
 الہ آباد میں تھا اور جواہر لال نہرو اس کے کاموں کے کرتا دھرتا تھے۔ انھوں نے سجاد ظہیر  
 اور ان کے ساتھ کے چند نوجوانوں کو کانگریس کی تنظیم میں مختلف ذمہ دار عہدوں  
 پر تعینات کر دیا۔ چنانچہ سجاد ظہیر اس زمانے میں الہ آباد سٹی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری  
 مقرر ہوئے تھے۔ اب انھوں نے ملک کے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ تقریباً دو سال تک  
 وہ پشاور سے مدراس اور کراچی سے کلکتے تک زمین کا گز بنے رہے۔ ہر جگہ اویہوں کے  
 تعاون سے شہر شہرا انجمن کی شاخیں قائم کیں، اور اس کی کل ہند کانفرنسیں منعقد کیں۔  
 یہ حقیقت ہے کہ چند ہی برس میں ادبی محاذ پر یہ تحریک سب سے زیادہ فعال  
 اور نتیجہ خیز بن گئی۔

لیکن حکومت کی نظر میں سجاد ظہیر کی یہ تمام سرگرمیاں خلافِ قانون تھیں۔ ان کی تسیام  
 انگلستان کے زمانے سے نگرانی ہو رہی تھی۔ اوائل ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی  
 جنگ شروع ہو گئی۔ کیونست اس میں انگریزوں کے خلاف تھے؛ اور برطانیہ سے  
 سامراجی جنگ قرار دے رہے تھے۔ اس پر حکومت ہند نے سب کیونست کارکنوں  
 کی گرفتاری کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء میں سجاد ظہیر بھی گرفتار کر کے سنٹرل جیل،  
 لکھنؤ بھیج دیے گئے۔ یہاں وہ کوئی سال بھر رہے ہونگے کہ بہت بیمار پڑ گئے اور  
 انھیں جیل سے میڈیکل کالج منتقل کر دیا گیا۔ اس کے تھوڑے دن بعد جرمن افواج نے  
 روس پر حملہ کر دیا۔ اب کیونست پارٹی کا رویہ بدل گیا اور متعدد دوسرے  
 رہنماؤں کے ساتھ سجاد ظہیر بھی دو سال کی قید کے بعد مارچ ۱۹۴۲ء میں  
 رہا ہو گئے۔

کیونست پارٹی کی زیرِ ہدایت سجاد ظہیر اپریل ۱۹۴۲ء میں بمبئی چلے گئے؛ اور وہاں  
 سے انھوں نے ہفتہ وار "قومی جنگ" جاری کیا۔ یہ اخبار بہت کامیاب رہا؛ اس  
 کی اشاعت دس ہزار تک ترقی کر گئی تھی۔ اس دوران میں سر وزیر حسن بہت  
 بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس لیے والدہ کے

اصرار پر انھیں جولائی ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ واپس آنا پڑا، جہاں اپنی بیماری کے زمانے میں سر وزیر حسن مقیم تھے۔ اسی علالت میں ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

جب تک ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، کیونست پارٹی بھی ایک تھی اور اس کی تنظیم بھی ایک۔ پاکستان بننے کے بعد اس کا ایک عمومی جلسہ اپریل ۱۹۴۸ء میں کلکتے میں منعقد ہوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کی الگ تنظیم کرنا چاہیے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے جناب زین العابدین احمد (زیڈ اے احمد، ممبر پارلیمنٹ) سے کہا گیا۔ لیکن کسی وجہ سے انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اب قرعہ قرال سجاد ظہیر کے نام پڑا۔ ادھر حکومت ہند نے کیونست پارٹی کو خلاف قانون انجمن قرار دے دیا اور اس کے پیشتر لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ سجاد ظہیر بھی حراست میں لے لیے جاتے۔ لیکن یہ اس زمانے میں بہت بیمار اور وہیں کلکتے کے ایک اسپتال میں زیر علاج تھے، اس طرح گرفتاری سے بچ گئے۔ لیکن ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ جب طبیعت کچھ بحال ہوئی، تو یہ بھیس بدلے ہوئے لکھنؤ آئے اور پھر اسی طرح بھیس بدل کر اپنی والدہ کو بتائے بغیر، ایک دن بمبئی اور وہاں سے ہوائی جہاز سے کراچی چلے گئے۔ بیوی سے بھی صرف اتنا کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں، ایک سال تک واپس آ جاؤنگا۔

لاہور میں رہ کر انھوں نے پاکستان کیونست پارٹی کی تشکیل کی اور اس کے جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ اسی زمانے میں پاکستان کی حکومت نے بھی کیونست پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ لہذا یہ لوگ چپ چاپ تے اپنا کام کرنے پر مجبور تھے۔ سجاد ظہیر کو بھی روپوش ہونا پڑا۔ انھوں نے اس دور کا ایک لطیفہ سنایا تھا۔

تاجیکستان (سوویت روس) کے مشہور ادیب ترسون زادہ اس زمانے میں لاہور آئے۔ قدرتا انھیں معلوم تھا کہ سجاد ظہیر وہاں ہیں۔ انھوں نے کسی دوست سے دریافت کیا کہ سجاد ظہیر کہاں ہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ترسون زادہ انگریزی نہیں جانتے؛ انھوں نے سوال فارسی میں کیا تھا۔ مخاطب پاکستانی دوست جو اب میں کہنا چاہتے تھے کہ سجاد ظہیر آج کل ”انڈر گراؤنڈ“ ہیں، لیکن وہ فوراً اس کے لیے فارسی



کا لفظ تلاش نہ کر سکے۔ انہوں نے لفظی ترجمہ کرتے ہوئے کہا: سجاد ظہیر زیر زمین رفتہ است۔ ظاہر ہے کہ ترسون زادہ اس کا اس کے سوائے اور کیا مطلب لیتے کہ سجاد ظہیر کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس پر انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ حادثہ کب اور کیونکر پیش آیا؟ اس پر پاکستانی دوست نے بہت مشکل سے انہیں سمجھایا کہ ان کا کیا مدعا تھا جو ب حقیقت کھلی، تو دونوں بہت ہنسے۔

سجاد ظہیر کیونست پارٹی کے رکن ہونے کے باعث بہت دن روپوش رہے۔ آخر کار حکومت پاکستان نے ۱۹۵۱ء میں مشہور راولپنڈی سازش کے مقدمے کی ذراغ بیل ڈال دی۔ اس مقدمے کے ملزموں میں بہت سے فوجی افسروں کے علاوہ چارسول کے آدمی بھی تھے، سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، محمد حسین عطا اور بیگم نسیم (میجر جنرل اکبر خان کی بیوی)۔ سجاد ظہیر پہلے سے روپوش تھے اور پوری تلاش کے باوجود پولیس کو ان کا سراغ نہیں ملا تھا۔ مقدمہ شروع ہوا، تو حکومت کو ان کی مزید تلاش ہوئی۔ اس زمانے میں خان قربان علی خان پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس تھے حکومت نے ان سے تاکید کیا کہ خواہ کچھ ہو، سجاد ظہیر کو بلا تاخیر گرفتار کر کے پیش کر دو۔ اس پر خان صاحب نے اپنے دست راست چودھری محمد اصغر کو بلا کر حکم دیا کہ تم ہفتے بھر میں سجاد ظہیر کو گرفتار نہیں کرتے، تو اپنے آپ کو ملازمت سے برطرف سمجھو۔ اس پر پولیس نے اپنی تنگ دوڑ و المضاعف کر دی۔

پولیس کو ایک مکان سے متعلق پہلے سے کچھ شبہ تھا کہ سجاد ظہیر شاید اس میں چھپے ہوئے ہیں؛ لیکن انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اس پر توجہ نہیں کی تھی۔ اب چودھری محمد اصغر کو جو نوکری سے برطرفی کی دھمکی ملی، تو انہوں نے سب سے پہلے اسی مکان کا رخ کیا۔ راتوں رات اس کے سامنے کے خالی قطعہ زمین میں لکڑی کی ٹال قائم کر دی۔ خفیہ پولیس کے سپاہی دکان چلانے لگے، اور پولیس ہی کے آدمی زیادہ گاہک بھی تھے۔ غرض اس طرح ۲۲ گھنٹے اس مشتبہ مکان کی نگرانی ہونے لگی۔ پولیس نے دیکھا کہ ایک نازک سا



دھان پان آدمی اس مکان پر صبح شام آتا ہے، اور تھوڑی تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر چلا جاتا ہے۔ پوچھ گچھ سے پتا چلا کہ وہ کیونسٹ پارٹی کا باقاعدہ رکن ہے۔ اسے گرفتار کر کے پولیس نے اپنے ہتھکنڈے جو استعمال کیا، تو اس نے اُگل دیا کہ واقعی سبجا ڈھیر اسی مکان میں پوشیدہ ہیں اور میں صبح شام انہیں کھانا پہنچانے آتا ہوں۔ پولیس نے اگلے دن اسے برقع پہنا کر سناٹھ لیا اور کہا کہ اپنے مخصوص طریقے سے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاؤ تاکہ سبجا ڈھیر کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ مانوس آواز جو سنی تو سبجا ڈھیر نے اندر سے کنڈی کھول دی۔ سجھیس بدلنے کو یہ اس زمانے میں بڑی بڑی موچھیں رکھے اور فرنیچر کے مخصوص گھیر دار شلوار اور سلٹی رنگ کے لمبے کرتے میں بلوس تھے؛ اور اپنے حلقے میں "مولانا" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ محمد اصغر نے ان سے پوچھا: آپ کا نام؟ انہوں نے خیال کیا کہ اب جھوٹ بولنا بیسود ہے؛ کھیل تو ختم ہو ہی گیا ہے۔ چنانچہ نہایت اطمینان سے کہا: سبجا ڈھیر۔ غریب محمد اصغر اپنی ساری تھکانیداریت کے باوجود ان کے سکون اور بے پروائی کے انداز سے سبھونچکا رہ گیا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ جب اس کے حواس کچھ سجا ہوئے، تو اس نے آگے بڑھ کر پستول ان کی چھاتی پر رکھ دیا اور کہا کہ میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں، اپنے آپ کو حوالے کر دیجیے۔ اور یوں انہیں حراست میں لے لیا۔

راولپنڈی سازش مقدمہ چلا۔ وکیل سرکار نے تو ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا، لیکن عدالت نے چار برس قید کا حکم سنا دیا۔ انہوں نے صرف دو سال حیدرآباد (سندھ) اور مچھ (بلوچستان) کے جیلوں میں کاٹے۔ فیض احمد فیض اور یہ جیل میں ایک ساتھ رہے تھے۔ فیض کا مجموعہ کلام "زنداں نامہ" اسی زمانے کی یادگار ہے۔

ہوا یہ کہ ہندوستان کی حکومت نے حکومتِ پاکستان پر ان کی رہائی کے لیے زور ڈالنا شروع کیا۔ دنیا کے اور ممالک کے اویسوں نے بھی حکومتِ پاکستان سے اپیل کی۔ یہ کوششیں بارور ہوئیں اور جولائی ۱۹۵۵ء میں وہ رہا کر دیے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حکومتِ پاکستان نے ان پر واضح کر دیا کہ آپ اس ملک میں رہے، تو آزاد

نہیں رہ سکتے، آپ کی جگہ کال کوٹھری کی سلاخوں کے پیچھے ہوگی۔ ہاں، اگر چاہیں، تو آپ کہیں باہر جاسکتے ہیں۔ اس پر وہ اگست ۱۹۵۵ء میں ہندستان چلے آئے۔ وہ جاتے وقت بیوی سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ سال بھر میں واپس آجاؤنگا؛ لیکن انہیں واپس آتے آتے سات برس سے زیادہ لگ گئے۔

پاکستان کے چار سالہ دورِ قید و بند میں انہوں نے دو کتابیں لکھیں۔ اول، تحریکِ ترقی ہندوستان کی تاریخ "روشنائی" کے عنوان سے۔ یہ بعد کو دہائی سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب فارسی کے مشہور شاعر حافظ کا تنقیدی مطالعہ ہے، جسے انجمنِ ترقی اردو نے "ذکرِ حافظ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ قید کے زمانے میں انہوں نے جو خط اپنی بیوی کو لکھے تھے، وہ بھی "خطوطِ زندان" کے عنوان سے ایک مجموعے میں چھپ چکے ہیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے شعر گوئی بھی شروع کی۔ دراصل ان کا یہ کلام شعر کی معرّفی کی ذیل میں نہیں آتا۔ یہ ایک طرح کی نثری نظم ہے۔ بہر حال اس پر تنقید کا یہ محل نہیں۔ ان کی یہ سب چیزیں ریپبلکنیلم کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ ان کا ایک اور کتابچہ "ہندی ہندستانی" بھی ہے، جس میں زبان پر بحث کی گئی ہے۔

آنے کو وہ ہندستان آئے، لیکن اصلی مشکل یہ تھی کہ وہ پاکستانی شہری تھے، اور اس حیثیت سے وہ زیادہ عرصے تک یہاں رہ نہیں سکتے تھے۔ اُدھر پاکستان انہیں آزادی سے اپنے وہاں رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ غرض عجیب گوگامو کا معاملہ تھا۔ سچا وظہیر اس مذہبِ عورتِ حال سے پریشان تھے۔ بارے یہ مسئلہ وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی ذاتی مداخلت اور سفارش پر طے ہوا؛ انہیں ہندستانی پاسپورٹ مل گیا اور حکومت نے انہیں ہندستانی شہری تسلیم کر لیا۔

۱۹۵۸ء میں "عوامی دور" کے مدیر بن کر وہ لکھنؤ سے دہلی آگئے۔ پھر جب نومبر ۱۹۶۳ء میں کمیونسٹ پارٹی نے دہلی سے ہفتہ وار "حیات" جاری کیا، تو وہ اس کے ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ اس کے بعد ان کا مستقل پیام یہیں رہا، اور وہ یہاں کی ادبی اور ثقافتی

زندگی میں بہت نمایاں حصہ لینے لگے۔

۱۹۷۲ء میں انھوں نے روس، جرمنی اور انگلستان کا طویل دورہ کیا۔ وہ وہاں کے کتابخانوں میں امیگزرو کے کلام نظم و نثر کے خطی نسخوں کا کھوج کرتے رہے، جن کا جشن روس اور ہندستان کے اشتراک سے ۱۹۷۴ء میں منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۱۹۷۳ء میں وہ پھر انگلستان گئے۔ وہاں سے انھیں افریقی، ایشیائی مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے قزاقستان (روس) کی راجدھانی "الماتاء" جانا تھا۔ لندن میں ان کی بڑی صاحبزادی نجمہ اپنے شوہر (علی باقر) کے ساتھ رہتی ہیں؛ وہ انھیں کے وہاں مقیم رہے۔

لندن سے وہ اگست کے آخر میں روانہ ہوئے اور چندے ماسکو میں قیام کرنے کے بعد الماتاء پہنچ گئے۔ مجوزہ کانفرنس ۲ سے ۹ ستمبر تک ہونے والی تھی۔ ۴ ستمبر صبح کے ناشتے پر بیٹھے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹر آیا؛ اس نے آرام کا مشورہ دیا۔ اگرچہ انھوں نے تکلیف کا دلیری سے اقا بلہ کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ساری عمر جس محنت سے کام کیا تھا، اس سے ان کا دل بہت کمزور ہو چکا تھا۔ نقاہت بتدریج بڑھتی گئی۔ اکتوبر کی صبح وہ بیہوش ہو گئے، اور پھر آخری لمحے تک ہوش میں نہیں آئے۔ اسی حالت میں جمعرات ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء صبح کے ساڑھے گیارہ بجے روحِ نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جدِ خاکی ہفتہ ۱۵ ستمبر صبح کے وقت ہوائی جہاز سے نئی دہلی پہنچا اور انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان 'جامعہ نگر' میں خوابگاہِ ابدی نصیب ہوئی۔

اب قدرت کی ستم ظریفی کا افسانہ سنئے۔ ان کے آخری قیام لندن کے دوران میں ایک دن کسی دوست کے ہاں ڈنر پر ایک امریکی جہان نے ان سے پوچھا، آپ کو ہندستان کے باہر کونسا ملک یا شہر سب سے زیادہ پسند ہے، یقیناً یورپ کی کوئی جگہ ہوگی؟ سجا ظہیر نے جواب میں کہا، نہیں، بلکہ مجھے روس کے ایشیائی علاقے اور ان میں بھی خاص طور پر قزاقستان کا خطہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ مشکل سے دو ہفتے

بعد ان کی تزاقتان کے دارالخلافہ الما آتا میں دفات ہونے والی ہے۔  
 ضمناً یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ "الما" کے معنی ہیں سیب اور "آتا" کے  
 باپ (اتا ترک میں بھی اتا انھیں معنوں میں ہے، جو مصطفیٰ کمال پاشا کے لیے بولا  
 جاتا ہے)۔ تزاقتان میں سیب بہت کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی بلا مبالغہ  
 سینکڑوں قسمیں ہیں۔ ریاست کی ساری صنعت و حرفت اور ایک طرح سے پوری  
 زندگی کا محور "سیب" ہی ہے۔ اسی لیے یہاں کے لوگوں نے اپنے دارالخلافہ کا نام ہی  
 "الما آتا" رکھ دیا ہے۔

ولایت سے واپسی کے دو برس بعد ۱۹۳۸ء کو ان کی شادی سید رضا حسین  
 پرنسپل اسلامیہ کالج، اجیر کی صاحبزادی رضیہ سے ہوئی تھی۔ یہ اس وقت بی اے  
 تھیں۔ بعد کو جب خاندان کا قیام الہ آباد میں تھا، تو انھوں نے ۱۹۴۱ء میں الہ آباد  
 یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کر لیا۔ جب سجاد ظہیر "تومی جنگ" کے  
 ایڈیٹر کی حیثیت سے بمبئی میں مقیم تھے، تو رضیہ نے تدریس کی ٹریننگ حاصل کی اور  
 وہیں رحمت اللہ کریم بھائی اسکول میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئیں؛ یہاں انھوں  
 نے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک تین برس کام کیا تھا۔ جب خاندان لکھنؤ واپس آیا، تو  
 ۱۹۴۸ء میں وہ وہاں کرامت حسین گریس کالج میں پڑھانے لگیں۔ وہ یہاں ۱۹۶۵ء  
 تک رہیں، اور اس کے بعد بچوں سمیت دہلی چلی آئیں۔ اولاد میں چار بیٹیاں ہیں؛  
 نجمہ، نسیم، نادرہ، نور۔ وہ رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے افسانے کے میدان میں مشہور  
 معروف ہیں۔ وہ جب سے دہلی آئی ہیں، یعنی ۱۹۶۵ء سے، سوویت دیس اخبار میں  
 مترجم کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

سجاد ظہیر اپنے اجباب میں "بنتے بھائی" کے عرف سے مشہور تھے۔ سب انھیں اسی  
 نام سے خطاب کرتے تھے۔ لیکن شاید ہی کسی کو اس عرف کی بنیاد معلوم ہو۔ ہے یہ کہ یوپی  
 میں یہ عام رواج ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو ان کے بچپن کے زمانے میں لاڈپیار سے  
 کسی نثر عرف سے پکارتی ہیں۔ ان کے خاندان میں عرف یہ تھے؛ علی ظہیر، علقن، حسن ظہیر



لکن حسین ظہیر، منٹن، سجاد ظہیر، بٹن، باقر ظہیر، بٹن۔ پھر والدہ آگے بڑھیں، تو انھیں علی الترتیب علی، لکے، منے، بنے، نبتے پکارنے لگیں۔ تو یہ ہے بنیاد بچے بھائی کی۔

مرحوم ہماری گنگا جہنی تہذیب کا بیٹھیر نمونہ تھے۔ تکلیف و وقار، سنجیدگی، کھگولی اور رکھ رکھاؤ ان کی فطرت اور کردار کے اجزائے ترکیبی تھے۔ میں نے برسوں کی ملاقات میں کبھی ان کے منہ سے کسی کے خلاف کوئی کلمہ نہیں سنا، گویا وہ کسی سے ناراض ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔

انہوں نے کچھ بہت زیادہ نہیں لکھا، اور ممکن ہے کہ جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی تاریخ ادبِ اردو میں کوئی وقیع جگہ نہ پاسکے۔ لیکن ان کا ایک کارنامہ ایسا ہے، جسے کوئی مورخ زبانِ اردو نظر انداز نہیں کر سکتا؛ اور یہ ہے، ترقی پسند ادب کی تحریک۔ اس کی تاسیس، ترتیب، تشکیل میں جو رول انہوں نے ادا کیا اور اسے پروان چڑھانے میں انہوں نے جن تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، وہ کوئی شخص سبھلا نہیں سکتا۔

اردو ادب میں درحقیقت چار تحریکیں ایسی ہوئی ہیں، جن کے اثرات بہت دیر پا رہے، بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اول، فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی تحریک، جس کے نتیجے میں اردو شکر کو پہلی مرتبہ اپنی زندگی اور قوت کا احساس ہوا؛ گلکرسٹ اس کی روح رواں تھے۔ دوسری، دلی کالج کی تحریک، جو بوترو اور اسپرنگر کے ہاتھوں باہم ترقی تک پہنچی۔ اس میں تراجم و تصانیف کے ذریعے سے زبان کا دامن مالا مال ہوا۔ تیسری، سرسید اسکول کی تحریک۔ اس میں زبان کی تصنیفی صلاحیتیں اپنے پورے عروج تک پہنچ گئیں۔ اس دور کی تصنیف و تالیف نے اردو کو عالمی زبانوں کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔ اور چوتھی تحریک، یہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے، جو ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر کی بدولت وجود میں آئی۔ اس نے اردو نظم و نشر کو نیا رخ دے دیا۔ جو لوگ اس سے وابستہ تھے، انھیں تو اس کے مقاصد کو سامنے رکھنا ہی چاہیے تھا؛ لیکن جو ادیب اس سے باقاعدہ منسلک نہیں ہوئے، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اس کے



بعد ان کی تخلیقات بھی نیا رنگ اختیار کر گئیں۔  
ایسی عہد آفریں شخصیت کو سجلا کوئی سجلا سکتا ہے!  
اب ان کے چند شعر سنئے:

دریا

آؤ میرے پاس آؤ نزدیک  
یہاں سے دیکھیں  
اس کھڑکی سے باہر  
نیچے اک دریا بہتا ہے  
دھندلی دھندلی ہلتی تصویروں کا  
خاموشی سے بوجھل  
زخمی سایوں میں  
تیر چھپائے تھر تھراتے، جلتے  
کناروں کے پہلو میں  
بیکل، دکھی  
اسے بھی نیند نہیں آتی

محبت کی موت

تم نے محبت کو مرتے دیکھا ہے  
چمکتی ہستی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں  
دل کے دالانوں میں پریشاں گرم لو کے جھبکڑ چلتے ہیں  
گلابی احساس کے بہتے سوتے خشک  
اور لگتا ہے جیسے  
کسی ہری بھری کھیتی پر پالا  
پڑ جائے!

لیکن، یارب!

آرزو کے ان مرجحائے سوکھے پھولوں

ان گم شدہ جنتوں سے،

کیسی حسد ملی

دل آویز

خوشبوئیں آتی ہیں

## تعزیت

شجرِ زلیست سے ایک اور ٹسر توڑ لیا

اس پر شجون کیا، وہ گلِ تر توڑ لیا

دستِ بیداد نے تابندہ گہر توڑ لیا

ظلم کے پنجے منوس نے بڑھتے بڑھتے

جس کی تابش سے پہنچتی تھی دلوں کو ٹھنڈک

سینہ لطف و کرم جس سے منور تھا، وہی

اس میں اک لعلِ گراں، شعلہ فگن ہے کہ نہیں

دُرِ خوش آب سے پُر، دل کی لگن ہے کہ نہیں

عزمِ انسان کی مغرور شکن ہے کہ نہیں

لیکن اے دوست! ذرا اپنے خزینے کو تو دیکھ

اس میں کچھ خونِ شہیدان کی جھلک ہے، ایسے

گوجہیں رنج سے واماندہ ہے، لیکن اُس پر

## جذب عالمپوری، راگھوندر راؤ

۲۰ اپریل ۱۸۹۲ء کو گنگاوتی (ضلع راجپور، کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت رام راؤ تھے۔ لیکن یہ محض دو سال کے تھے کہ عالمپور (ضلع محبوب نگر، تلنگانہ، آندھرا پردیش) کی ایک متمول اور صاحبِ جاواد برہمن بیوہ شریستی سیتا بانی نے انہیں گورنر لے لیا۔ اس کے بعد ان کا اپنے اصلی خاندان سے سلسلہ ٹوٹ گیا، اور وہ نئے خاندان کے چشم و چراغ بن گئے۔

ان کی تعلیم اچھے خاصے اہتمام سے ہوئی تھی اور وہ ہفت زبان تھے۔ تلگو تو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ کنڑی اپنے چچا پنڈت مادھوراؤ وکیل سے، اور اردو فارسی پنڈت رام نرسو سے پڑھی۔ سید مخدوم حسین عرف خواجہ پیراں عربی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اسی طرح سنسکرت اور ہندی کی تعلیم کے لیے ایک پنڈت رکھے گئے تھے (افسوس کہ ان کا نام نہیں معلوم ہو سکا) چچا کی تقلید میں انہوں نے بھی وکالت کا پیشہ اختیار کرنا پسند کیا۔ چنانچہ جوڈیشل امتحان (اردو) میں بیٹھے اور وکالت کی سند حاصل کی۔ تقریباً پندرہ برس تک کامیابی سے وکالت کی۔ لیکن اس زمانے میں دن رات کی محنت سے ان کی صحت کچھ ایسی بگڑ گئی کہ انہیں بادلِ ناخواستہ اس پیشے سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی کوئی کام نہیں کیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن شعروادب کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۹۲۸ء میں جب ریاست حیدرآباد کا الحاق ہوا، تو وہ عالمپور سے نقل مکان کر کے حیدرآباد چلے آئے، اور مستقلاً یہیں کی سکونت اختیار کر لی۔

انہوں نے شعر گوئی ۱۶ برس کی عمر میں شروع کی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب احمد حسن شوکت میرٹھی (ف دسمبر ۱۹۲۲ء) کا بڑا غلغلہ تھا؛ وہ اپنے آپ کو مجدد السنہ شرفیہ کہتے تھے؛ اور ان کے دور سائلے "پروانہ" اور "شعۃ ہند" ان کے "تجدد" کی تبلیغ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا رہے تھے۔ جذبہ نے بھی اپنے کلام پر اصلاح کے لیے شوکت کا انتخاب کیا۔ غالباً چندے غلام محمد عرف ترک علی شاہ ترکی (ف مارچ ۱۹۱۹ء) سے بھی مشورہ رہا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سید نظیر حسن سخا دہلوی (ف فروری ۱۹۳۳ء) سے بھی استفادہ کیا؛ خاص طور پر عرض میں ان سے مشورہ کرتے رہے۔ ان دونوں حضرات کے انتقال کے بعد حیدرآباد کے مشہور رباعی گو شاعر حضرت امجد حسین امجد (ف مارچ ۱۹۶۱ء) اور جگر بریلوی سے رجوع کیا۔

جب تک عالمپور میں قیام رہا، ان کی ذات مرکز شعر و ادب بنی رہی۔ انہوں نے یہاں "بزم نہالی سخن" قائم کی تھی۔ اس کے ماہانہ جلسوں کی یہ خصوصیت تھی کہ غزل اور نظم کے علاوہ اس میں نثری مضامین بھی پڑھے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان جلسوں کی شہرت دور دور تک پہنچی، اور باہر کے شاعر اور ادیب بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ ان مشاعروں سے جہاں ریاست حیدرآباد کے دور دست خطوں میں اردو کی ترویج ہوئی، وہیں خود ان کا نام بھی ساری ریاست میں شاعر اور محب اردو کی حیثیت سے لوگوں میں مشہور ہو گیا۔

انہوں نے اسی برس کے قریب عمر پائی۔ آخر تک تندرستی ٹھیک رہی؛ کوئی جسمانی عارضہ بھی لاحق نہیں تھا۔ لیکن کبرسنی کے باعث کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی میں ۲۸/۲۷ ستمبر ۱۹۷۳ء کی درمیانی شب کے ڈھائی تین بجے (یعنی ۲۸ ستمبر کے ابتدائی وقت میں) روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اولاد میں ایک بیٹا اشرفی پرہلا دراد (اولین صاحبزادہ) (جے دیوی، بھاگیا عرف لیلا بانی؛ راجما عرف سندنہ) اپنی یادگار چھوڑیں۔ شہری پرہلا دراد میونسپل کارپوریشن، حیدرآباد میں ملازم ہیں۔

جذب نے رباعی کے میدان میں خاصی شہرت حاصل کی؛ بلکہ آندھرا اردو مجلس کی طرف

سے انھیں "خیام آندھرا" کا لقب بھی ملا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے رباعی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ سازِ غزل بھی چھپ چکا ہے (حیدرآباد ۱۹۷۲ء) ان کے رباعیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے، رباعیاتِ جذب، ارمغانِ جذب، صد پارہٴ جذب (۱۹۷۴ء)؛ تحفہٴ جذب (۱۹۷۹ء)؛ آہنگِ جذب (۱۹۷۰ء) آخر الذکر کے دو حصے ہیں؛ احساساتِ جذب اور معلوماتِ جذب۔ ان کے سنسکرت، تلگو اور کنڑی کے منظوم تراجم اور ایک نثری تصنیف بھی شائع ہو چکی ہے بعض مسودے طبع ہونے سے رہ بھی گئے۔ ان میں جنوبی ہند (مدراں و میسور) کے شعرا کا ضخیم تذکرہ "غمانہ کہن" زیادہ اہم ہے، جسے انھوں نے ۱۳۷۱ھ میں مکمل کیا تھا۔ (نام تاریخی

ہے) کلاسیکی انداز کا بہت پختہ کلام ہے۔ تصوف کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ ہر جگہ زبان اور بیان کی سنجیدگی ان کا ماہرہ الاتیاز ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، جو ان کی وفات تک ملتا رہا۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں:

جو نفس کا بندہ ہے، وہ ناکام ہے کیوں؟	دنیا سے وفا میں نفس بدنام ہے کیوں؟
ہے نفس بھی تیری دین، دل ہی کی طرح	پھر نفس نوازی کا یہ الزام ہے کیوں؟
بجھ جائیگا اک روز چراغِ ہستی	اک روز اچڑ جائیگا باغِ ہستی
مٹ جائیگا، اے جذب! ہر اک نقشِ وجود	ڈھونڈے بھی لیگانہ سراغِ ہستی
جامِ عشرت کو کبھی بھرنہ سکے	اور دورِ مصیبت میں کبھی مرنہ سکے
خوش بخت ہیں وہ جو نیکیاں کرتے ہیں	جی بھر کے ہم گنہ کبھی کرنہ سکے
جو فلسفہٴ حیات کا دانا ہے	وہ رنج سے اور خوشی سے بے پروا ہے
ہیں رنج و خوشی صرف فریبِ ہستی	دنیا اپنی جگہ خود اک دھوکا ہے
گذری ہے ہمیشہ اشک پیتے پیتے	گذری ہے جگر کے زخم میتے میتے
امید پر دنیا میں رہے ہم زندہ	آرام ملا کبھی نہ جیتے جیتے



یہ عالم عیش و خواب ہم پر بھی تو تھا  
تھے ہم بھی کبھی رولقِ عالم اے جذب!  
یہ سایہ آفتاب ہم پر بھی تو تھا  
کچھ وہم سا ہے، شباب ہم پر بھی تو تھا  
خاموشی میں اندازِ اثر پیدا کر  
جو کبر سے خالی ہو، وہ سر پیدا کر  
ہرزہ میں کائنات پوشیدہ ہے  
سب کچھ نظر آئیگا، نظر پیدا کر  
انفالِ گزشتہ کو بھی یاد نہ کر  
مستقبل کے لیے بھی فریاد نہ کر  
جو کچھ ہوا، ہوا، جو ہوگا، ہوگا  
تو نکر میں اپنی عمر برباد نہ کر  
وہ جوشِ طبیعت، وہ روانی نہ رہی  
دہ حرص وصال، وہ کامرانی نہ رہی  
تھا جذب! شباب! اک جہانِ امید  
جب وہ نہ رہا، تو زندگانی نہ رہی  
اپنے خالق کو ایک مانا میں نے  
چھانا تحقیق میں زمانا میں نے  
سمجھا تو یہی کہ کچھ نہ سمجھا اے جذب!  
جانا تو یہی کہ کچھ نہ جانا میں نے  
دل آئینہ ہے بے جلا کہاں ہوتا ہے  
بے سعی بھی کوئی کامراں ہوتا ہے  
گھٹتی ہے سیاحت سے کدورتِ دل کی  
پانی ہے وہ پاک جو رواں ہوتا ہے

معتوق و شراب دم کنارا اور کبھی ہیں  
مجھ پر ہی فقط آفتاب تیرا کیوں ہے؟  
پاپند ہوس سیاہ کار اور کبھی ہیں  
میری ہی طرح گناہ نگار اور کبھی ہیں  
کس سمت ہے جلوہ گاہ معلوم نہیں  
خود آ، اے دوست! رہنمائی کر لے  
کہیں ہے ابر بہار گلشن کہیں ہے شبنم کہیں ہیں آنسو  
ہزار پردوں میں رنگ و بو کے برس رہا ہے شباب تیرا  
اگر کفر ہی پر بنا عشق کی ہے  
تو کافر ہے پھر جو مسلمان ہوگا  
ارے دستِ جنوں کی یہ درازی  
کہاں تک سلسلہ ہے پیرہن کا  
ہر سچی اعتبار و یقین راہِ نیک ہے اب  
مذہب! چل راہِ مجتہدین جدھر دل لے جائے  
دینا میں اعتبار کسی کا کہاں ہے اب!  
راہِ ہیر سے نہ آتق کسی رنگیر سے کر  
گو جاناموں، تجھ کو خبر بھی نہیں ہوتی  
لینا ہوں کچھ بھی نام تیرا بار بار روز

مجھے مطلب ہے سجدہ کرنے سے بُت ہے یا وہ خدا، نہیں معلوم  
 بڑی مشکل سے ہم لائے گئے تھے تیری محفل میں  
 مگر محفل سے اٹھ جانے کا پھر ارمان ہے دل میں

سجدوں کا شغل، اے دلِ سودا نشانِ نہ چھوڑ سرچا ہے ساتھ چھوڑ دے، تو آستانِ نہ چھوڑ  
 آنکھوں میں آگیا ہے سمٹ کر جہانِ دل میری نگاہ دیکھ، مرا مدعا نہ پوچھ  
 وہ آئے، اور چلے گئے بزمِ خیال سے اتنی زرا سی دیر میں کیا ہو گیا، نہ پوچھ  
 ہر پہا ہے جاوے منزل میں را ہزن چاہے کب تک ہی جائے، مگر رستانہ پوچھ

مر رہے ہیں، مگر نہیں مرتے واہ کیا زندگی ہماری ہے  
 میری نظروں کی خیرہ سامانی تیرے جلووں کی پاسداری ہے  
 دل تمھارا ہے، میری چیز نہیں جان میری نہیں، تمھاری ہے  
 جاگتے ہیں پھول، جگنو، برگ و بار آج تقدیر چین بیدار ہے  
 ہے یہ طوفانِ صرف تا حدِ جمود دل میں، لہراٹھی، تو بیڑا پار ہے  
 کر لیا اقرار میں نے آپ کا اب مجھے ہر چیز سے انکار ہے  
 یہ تیزی یہ خسرانِ حسن، توبہ! وہ چلتے ہیں کہ لڑتے ہیں ہو اسے

بس اک سادہ نگاہی ہے دلِ ناکارہ کی قیمت

زیادہ ہو، تو پھر جو کچھ سزا جیاریں آئے

عشق کی لذت نہ پوچھ، اے ہمنشیں! عشق، بس اک لذتِ بے نام ہے

## اتر حیدرآبادی، سردار بیگم

۹ مارچ ۱۹۱۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کی نواب اعظم یار جنگ چراغ علی سے کچھ عزیزداری تھی، لیکن میں رشتہ متعین کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ ان کے والد سید امیر حسن تھے اور دادا سید کریم حسن قمر لکھنوی۔ قمر شعر کہتے تھے اور داغ کے شاگرد تھے۔ اصل میں یہ خاندان لکھنوی تھا۔ لیکن اودھ کے الجاق کے بعد ان کے آبا و اجداد ترک وطن پر مجبور ہوئے اور جاگیر حیدرآباد میں بس گئے۔ جب سے یہ لوگ عزت و آبرو سے یہیں بسر کر رہے ہیں۔

سید امیر حسن کا ۱۹۲۲ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سردار بیگم کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بار ان کے چچا محبوب علی صاحب کے کندھوں پر آ پڑا۔ انھوں نے ابتدا میں کچھ تھوڑا بہت گھر پر پڑھا؛ اس کے بعد محبوبیہ گرس اسکول، حیدرآباد میں تعلیم پائی۔ بہت جلد خان صاحب عبدالغنی رئیس نصیر آباد چھاؤنی (راجستھان) سے شادی ہو گئی، جو قنوج میں ٹھیکیداری کرتے تھے؛ اور اسی سلسلے میں کانپور میں سکونت پذیر تھے۔

سردار بیگم کے مزاج میں شروع سے ولولہ اور سیما بیت تھی۔ یہ سیاسی بلچل کا زمانہ تھا۔ چنانچہ وہ بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لینے لگیں۔ اولاً علامہ عنایت اللہ خان مشرقی (ف اگست ۱۹۶۳ء) کی خاکسار تحریک میں اور بعد کو مسلم لیگ کے دور میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ خان صاحب عبدالغنی متمول آدمی تھے؛ سردار بیگم کی ذاتی ملکیت ایک سنیما گھر (برٹی ٹھیٹر) بھی تھا، غرض مالی پہلو سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لہذا سماجی اور سیاسی ذوق کی تسکین ان کے لیے آسان تھی۔ انھوں

نے مشرقِ بعید کا سفر بھی کیا تھا۔ بعد کو جب عبدالغنی صاحب نے بنگلور میں مستقل سکونت اختیار کی، تو سردار بیگم بھی ان کے ساتھ وہیں مقیم ہو گئیں۔ ۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو بنگلور ہی میں رحلت ہوئی؛ اپنے سکونت کے بنگلے (السور) میں دفن ہوئیں جسما نی یادگار صرف ایک لڑکا عثمان غنی (عرف منا) چھوڑا۔

ان کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ پہلی ”صحیفہ درخشاں“ کے عنوان سے، اس میں نعتیہ کلام ہے؛ دوسری ”تضمین اقبال“ جس میں اقبال کی بعض نظموں کی تضمین کی ہے۔ اب چند شعر بطور نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

سنگاپور میں ایک مسلم دوشیزہ کو مجبوراً قص دیکھ کر

حسن کی عریانیاں، باعثِ نخر و کمال  
کاش کے ملتا مجھے جلوہٴ ماضی ترا  
سنگِ خرد بارِ عقل، ہو ہی گیا کامیاب  
کتنی اداتوں کے ساتھ، آج ہے محو خرام  
جلوہٴ افرنگ کی، آہ! یہ انسوؤں گری  
حُسن کہاں، حُسن کا صرف ہے وہم و فریب  
حُسن میں ہے اب کہاں دکھتی زندگی  
عشق کو انسوؤں سے حُسن کی تقدیر پر  
سازِ رمِ ذوق میں، بر لبِ پُرشوق میں  
پی کے مے مغربی، آنہ بہت جوش میں

چشمِ بصیرت مری دیکھ چکی آہ، آہ!

موت سے پہلے ترا سا نوحہ ارتحال

عالمِ رنگ و نغمہ میں کیف بہت سی، مگر  
ان کی بھی آنکھ ہو گئی جوشِ الم سے آج تر  
بخود سیرِ کاٹنات، اپنی طرف بھی اک نظر  
میں نے اٹھائی کیوں نگاہِ عالمِ درد میں ادھر

یوں نہ پہنچ سکیگا تو، ان کی حریم ناز میں  
 عشق کی تیغ تیز سے عقل سے پہلے جنگ کر  
 شکل حسین دکھائے جا، پردہ درمیاں اٹھا  
 شوق مرا ہے پارسا، عشق مرا ہے معتبر  
 میری تیز شوق کو ایک زمانہ چاہیے  
 تیرا ہوا بھی ہے مرد، میری نوا ہے گرم تر  
 آہ شرابِ شوق کا کیف بہت عجیب ہے  
 وہ ہیں کہ مجھ سے بے نیاز اور میں ان سے بے خبر

تیری فغان نے کر دیا سینہ گل کو چاک چاک

اختر خوش نوا! خوش! اختر خوش نوا! پھر

کسی کھوئے ہوئے کی جستجو کیا  
 کسی بچھڑے ہوئے کی آرزو کیا  
 ترے رُخسارِ زمیں کے مقابل  
 گل دگلزار میں ہے رنگ و بو کیا  
 نماز عاشقاں میں، اسے عزیزو!  
 تیمم کس کو کہتے ہیں، وضو کیا  
 نہ آئے آج تک، تو روزِ محشر  
 وہ آئینے ہمارے رو برو کیا

پہنچ جاؤں شہرِ بلو لاک کے پاس

مری ہے اور اختر! آرزو کیا!

تبسم ہی تبسم ہے، جوانی ہی جوانی ہے۔

خدا رکھے، محبت حاصل صد زندگانی ہے

کیا پوچھتے ہو عشق کی افتاد کا عالم  
 خاموش بھی رہنے میں ہے فریاد کا عالم  
 ہر سانس میں، ہے حُسن پر آشوب کا پیغام  
 ہر گام پہ ہے عشقِ ستم زاد کا عالم  
 افسرے آئینِ محبتِ لب ہلا سکتے نہیں  
 نالہ کر سکتے نہیں، نغمہ سنا سکتے نہیں  
 واہ رے جذبِ محبت! افسرے بھوری حسن!  
 بھول جانے پر بھی وہ مجھ کو بھلا سکتے نہیں  
 مختصر ہے بس یہ، اختر! شرحِ آدابِ وفا  
 آگ سی دل میں لگی ہے اور بچھا سکتے نہیں  
 جن سے ہوا سٹھا کبھی سینہ عالم گداز  
 مجھ کو سنا دیجیے، پھر وہ نوا ہائے راز  
 ذوقِ طلب ہے، تو پھر سودوزیاں سے گزر  
 راہِ وفا میں نہ کر فکرِ نشیب و فراز

آہی گئی آج نیند، سنگِ دریا پر

بیخودی آرزو، عمر ہو تیسری دراز!



## بکر و محبوب، راجا محمد امیر احمد خان (والی محمود آباد)

وادھیالی سلسلہ مشہور صحابی محمد بن ابی بکر تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد میں ایک صاحب نصر اللہ جو بغداد میں عہدہ قضات پر فائز تھے، بارہویں صدی میں ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے؛ یہاں بھی ان کی تین نسلیں دلی میں اسی عہدے پر تنگن رہیں۔ ۱۳۴۵ء میں خاندان کے ایک فرد قاضی نصرت اللہ (عرف شیخ نقی) کو محمد بن تعلق نے ضلع بارہ بنگی کے سرکش قبیلے ”بھار“ کی سرکوبی کا حکم دیا، اور ان کی کامیابی پر انھیں جاگیر عطا کی۔ ایک دوسرے فرد داؤد خان نے کبھی بہت شہرت حاصل کی۔ انھیں کے بیٹے محمود خان نے محمود آباد بسایا تھا۔

مغلوں کے بعد اودھ کے شاہی زمانے میں بھی ان کا اقتدار اور جاہ و جلال قائم رہا۔ ۱۸۵۰ء میں شاہ اودھ نے خاندان کے سربراہ نواب علی خان کو راجا کا خطاب عطا کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں راجا نواب علی خان نے بھی سرگرم حصہ لیا تھا، لیکن آخر کار انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد امیر حسن خان نے رفاہ عامہ کے کاموں میں خاص طور پر بہت حصہ لیا۔ انگریزوں نے ان کا شاہی خطاب تسلیم کر لیا، بلکہ اپنی طرف سے اس پر K.C.I.E کا اضافہ کر دیا۔ ان کی وفات (۱۹۰۳ء) پر ان کے بڑے صاحبزادے راجا محمد علی محمد خان ان کے جانشین ہوئے۔ انگریزوں نے انھیں ذاتی خطاب بہار راجا سے نوازا تھا۔ بہار راجا محمد علی محمد خان اپنے زمانے کی مشہور شخصیت تھے۔ اس عہد کی بیشتر تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔ وہ مجلس وادھیا تواریخ کے رکن بھی رہے تھے۔

مرحوم راجا محمد امیر احمد خان انھیں مہاراجا محمد علی محمد خان کے بڑے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ ان کے نانا سید فیاض حسین کنتوری تھے۔ جن کا سلسلہ نسب امام، مفتی حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام سے ملتا ہے۔ راجا محمد امیر احمد خان جمعرات ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو محمود آباد میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچے، تو تعلیم کا بخئی انتظام کیا گیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے مولانا سید ظفر مہدی گہر مقرر ہوئے۔ عزیز لکھنوی پہلے سے بحیثیت کتابدار ریاست کی ملازمت سے منسلک تھے؛ وہ اردو زبان و ادب کے درس کے ذمہ دار قرار پائے۔ اسی طرح انگریزی پڑھانے پر بھی ایک استاد مقرر ہوئے۔ جب چند برس میں یہ مراحل بحسن و خوبی طے ہو گئے، تو لکھنؤ کے مشہور لاماٹینیر کالج سے سینئر کمبرج کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے برادر خورد مہاراجا جگمار امیر سید رخاں کے ساتھ مزید تعلیم کے لیے انگلستان بھیجے گئے، لیکن اسی دوران میں ان کے والد مہاراجا محمد علی محمد خان بہادر کا انتقال ہو گیا، اور انھیں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ البتہ چھوٹے مہاراجا جگمار وہیں رہے اور انھوں نے پیرسٹری کی سند حاصل کی۔

چونکہ دونوں بھائی کمسن تھے، اس لیے ان کی صغر سنی کے زمانے میں ریاست کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے مہاراجا محمد علی محمد خان مرحوم نے اپنی وفات سے پہلے ایک مجلس اُمناء (بوورڈ آف ٹرسٹیز) کی تشکیل کی تھی، جس کے اراکین مسٹر محمد علی جناح، سر وزیر حسن، بم بہادر شاہ اور ڈپٹی حبیب اللہ تھے۔ اس مجلس نے راجا امیر احمد خان کے بالغ ہونے تک محمود آباد کے نظم و نسق کی نگرانی کی۔

راجا امیر احمد خان کو ۱۹۳۶ء میں پورے اختیارات عطا ہوئے۔ یہ ہندستان کی سیاست کا بید ہنگامہ خیز اور فیصلہ کن دور تھا۔ ممکن ہے، مجلس اُمناء کے اراکین کے نقطہ خیال کا بھی کچھ اثر رہا ہو، بہر حال راجہ صاحب موصوف مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا، اس کا سارا انتظام بھی انھیں نے کیا تھا اور اس کے جملہ اخراجات (دو لاکھ روپیہ) بھی خود برداشت کیے تھے۔ اس

کے بعد وہ مدتوں مسلم لیگ کے خازن رہے اور رفتہ رفتہ اس کے صفِ اول کے کارکن کی حیثیت سے انھوں نے بہت نام پیدا کیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۷ء تک کے گیارہ برس میں وہ ملکی سیاست کے مرکز میں رہے۔ اس دور میں ان کی ملاقات بعض سیاسی لیڈروں سے ہوئی، جن میں پی، سی جوشی اور سید سجاد ظہیر نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اصحاب کی ترغیب پر انھوں نے کمیونسٹ لٹریچر کا وسیع مطالعہ کیا۔ اپنی ٹھیکہ مذہبیت اور اسلام پر اٹل اعتقاد کے باعث وہ کمیونسٹ تو بن نہیں سکتے تھے، لیکن بہر حال وہ اشتراکی خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ انھوں نے اشتراکیت کا غائر مطالعہ کیا، تو ان پر یہ حقیقت اور واضح ہو گئی کہ اسلام کا اقتصادی نظام کسی طرح اشتراکی طریقے سے کم منصفانہ نہیں۔ کمی ہے تو اس کی کہ اسے پورے پر نافرمان نہیں کیا جاتا۔ اس پر انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کا آغاز ریاست محمود آباد سے کیا جائے۔

انھوں نے حکم دیا کہ تمام زمین کی پوری جانچ پڑتال کی جائے؛ مزارعین کے نام اس قطعہ زمین کے گوشوارے میں درج ہوں، جسے وہ کاشت کرتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پوری ریاست کی اٹلاک ایک انجمن امدادِ باہمی (کوآپریٹو سوسائٹی) میں تبدیل کر دی جائیں، جس میں وہ خود اور ان کے تمام مزارع حصہ دار ہوں؛ اور سب کو حصہ رسدی منافع میں شریک کیا جائے۔ لیکن بدلتے حالات کے باعث ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

۱۹۷۷ء میں آزادی آئی، ملک تقسیم ہوا، اور حالات نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ ہندستان سے ہجرت کر جائیں۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ پاکستان میں بھی نہ رہ سکے، جس کے قیام کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانی دی تھی۔ چنانچہ دل برداشتہ ہو کر وہ بغداد (عراق) چلے گئے۔ چونکہ ان کے معتقدات کے تمام مراکز اسی ملک میں تھے، اس لیے یہاں کا قیام ان کے لیے تسکینِ روح و دماغ کا باعث ثابت ہوا۔ بسراوقات کے لیے انھوں نے تجارت کا سہارا لیا۔ شہر میں مشینوں کی اچھی خاصی وسیع دکان کھول

لی۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں یہیں بغداد میں ہوئی۔  
 راجا صاحب موصوف کبھی کبھی پاکستان جاتے رہتے تھے۔ وہاں ان کی کچھ سکنی جا داد بھی تھی؛ اس کی  
 دیکھ بھال بھی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ احباب کی بھی کمی نہیں تھی، ان سے ملنے۔ کئی مرتبہ  
 ان سے وزارت میں شامل ہونے کی درخواست کی گئی۔ لیکن وہ حالات سے سمجھوتا نہ کر سکے  
 اور انھوں نے ہر مرتبہ اس سے انکار کر دیا۔ لیکن اس میں بھی شبہہ نہیں کہ ان کی مالی  
 حالت بہت کمزور ہو گئی تھی اور وہ اس پہلو سے فکر مند تھے۔ حسن اتفاق سے اس کا  
 ایک حل نکل آیا۔

۱۹۵۸ء (یا شاید ۱۹۵۹ء) میں دول العربیہ (عرب لیگ) نے فیصلہ کیا کہ لندن میں  
 ایک اسلامی ثقافتی مرکز قائم کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے دس لاکھ پونڈ کا سرمایہ  
 جمع کیا، جس کا بیشتر حصہ غالباً سعودی عرب اور کویت نے دیا تھا۔ حکومت انگلستان  
 کارویہ ہمدردانہ تھا، کچھ گفت و شنید کے بعد وہ شہر کے وسط (پارک روڈ ریجنٹ) میں  
 ایک پرانی تاریخی عمارت مجوزہ مرکز کے لیے دیے پر آمادہ ہو گئی۔ چنانچہ دفتر کھل گیا  
 اور اس کے پہلے مدیر ایک مصری صاحب (ذکی عبدالقادر) مقرر ہوئے۔ ان کا تقرر  
 تین سال کے لیے ہوا تھا۔ جب ۱۹۶۱ء میں ان کی میعاد ختم ہو گئی اور وہ قاہرہ واپس  
 چلے گئے، تو تھوڑی سی کوشش سے ان کی جگہ پر راجا صاحب موصوف کا تقرر  
 ہو گیا۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک میں بلجیم میں مقیم رہا تھا۔ اس زمانے میں بارہا لندن جانے  
 کا موقع ملا۔ اور چونکہ میرے ایک عزیز دوست وہاں اسی اسلامی مرکز میں عربی  
 پڑھانے پر تعینات تھے، اس لیے اکثر وہاں جاتا، یوں راجا صاحب مرحوم سے بھی ہمیشہ  
 ملاقات ہوتی رہی۔ میں آخری مرتبہ جون ۱۹۶۹ء میں یورپ اور لندن گیا، تو پھر  
 حاضر خدمت ہوا۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ ان کے لطف و کرم کی یاد میرا  
 سرمایہ حیات ہے۔

چونکہ زندگی بچہ سادہ تھی، اور محنت کے عادی تھے، اس لیے صحت بالعموم ہمیشہ اچھی



رہی۔ لیکن وقت موجود تو کسی کے ہاتھ نہیں مل سکتا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو جمعہ ۱۲ رمضان ۱۳۹۳ھ کو دفعۃً فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ بیہوش ہو گئے۔ فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ علاج معالجے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ لیکن بیسود۔ اسی حالت میں دو دن بعد (۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء) اتوار صبح کے وقت اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ ان کے خاندان کی خاص ہڑواڑ کر بلائے معالیٰ میں موجود ہے؛ نعش کو وہیں دفن کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن انہیں ایام میں مغربی ایشیا میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور محفوظ ذرائع آمد و رفت کا فقدان تھا۔ اس لیے طے ہوا کہ فی الحال لاش امانتاً روضہ امام فاضل مشہد (ایران) میں سپرد کر دی جائے؛ بعد کو جب حالات سازگار ہوں، اسے کر بلائے معالیٰ منتقل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق لاش ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو لندن سے تہران آئی، اور اسی دن مشہد پہنچی، جہاں اسے قبرستان ”بارغ رضوان“ میں سپرد کیا گیا۔

متعدد اصحاب نے تاریخ وفات کہی ہے۔ مزاج نگار شاعر سید مبارک حسین ڈیوٹ نے عیسوی تاریخ کہی؛ خلد میں فخر دو عالم والی محمود آباد (۱۹۷۳ء) اور بھری میں ڈاکٹر ارشاد علی کیف محمود آبادی کا پورا شعر ہے:

فکرِ تاریخ مرگ کیا ہوگی      کیف غم ہی نے دل کو توڑ دیا  
”کہیے راجا امیر احمد نے      بزم ہستی کو آہ چھوڑ دیا“ (۱۳۹۳ھ)

مرحوم کو ادب سے شغف اور شعر گوئی ورثے میں ملی تھی۔ ان کے پردادا راجا نواب علی خان بہادر شعر کہتے تھے، اور اس میں غالباً آغا جوش شرف لکھنوی کے شاگرد تھے۔ دادا راجا محمد امیر حسن خان بہادر مرثیہ کہتے تھے اور اس میں حبیب تخلص کرتے تھے؛ نزل میں ادب کا تخلص سحر تھا۔ نفیس لکھنوی کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ ممکن ہے، ان سے مشورہ بھی رہا ہو۔ مرحوم کے والد ہمارا محمد علی محمد خان بہادر کا تخلص مرثیہ میں محب اور غزل میں ساحر تھا۔ اسی روایت کو راجا محمد امیر احمد خان نے جاری رکھا؛ مرثیہ میں ان کا تخلص محبوب تھا اور غزل میں بحسب



کلام پر اصلاح میر علی محمد صاحب عارف سے لی۔

اسخوں نے مرثیے میں مسدس کی کلاسیکی ہیئت قائم رکھتے ہوئے، اس میں نئے مضامین اور رجحانات داخل کیے۔ مرثیہ پڑھتے بھی خوب تھے اور اس میں بھی اسخیں خاص امتیاز حاصل تھا۔ نہ صرف محمود آباد ہی میں، بلکہ کبھی کبھی بیتکلف احباب کے اصرار پر باہر بھی مجلس میں پڑھنے میں تامل نہیں تھا۔ گاہے گاہے نئی صحبتوں میں سوز اور نوحہ بھی پڑھتے تھے جن اصحاب نے اسخیں پڑھتے سنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ خاندانِ انیس کے کامیاب نمائندے تھے۔

افسوس کہ کلام کا مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ صرف کچھ مرثیے اور اسلام اور چند غزلیں رسالوں میں چھپی ہیں۔ ایک مرثیے کے چند ابتدائی بند اور کچھ اور کلام جو بعض رسائل سے جمع کیا گیا ہے، بطور نمونہ نذرِ ناظرین ہے:

### مرثیہ

بہاں کے واسطے ہے وجہِ زندگی پانی ہے چشمِ عالمِ ایجاد کی تری پانی  
رگوں میں دہر کی دوڑا کیا یہی پانی اسی سے مشکل اہل جہاں ہوئی پانی

بڑھے ہوئے ہیں اسی سے تپاک کے دامن

اسی نے رنگ دیے صحنِ خاک کے دامن

اسی سے پانی ہے روحِ حیاتِ ہستی نے چھلک پڑے ہیں اسی سے فلک کے گنجینے

اسی کے دم سے کشادہ بچار کے سینے اسی نے نصب کیے ہیں جہاں میں آئینے

زمانے بھر کے لیے وجہِ زندگی گانی ہے

فلک کی آنکھ کا تارا زمین کا پانی ہے

اسی کی وجہ سے آباد دُورِ دارِ حیاتِ اسی سے گلشنِ ہستی میں ہے بہارِ حیات

اسی کے دم سے ہے وابستہ اعتبارِ حیاتِ یہی ہے جانِ حیات اور یہی مدارِ حیات

ہے روح ہر متحرک کی اور ساکن کی

صداسنو تو من النساء کل شیء کی

خزاں کے زور اسی کی نمود سے ٹوٹے      مزے اسی سے چمن نے بہار کے لوٹے  
 اسی نے دامن گل پر بنائے گل بوٹے      اسی کی چوٹ سے گلشن میں آبلے پھوٹے  
 اسی کی آب نے گوہر کو کر دیا پانی  
 اسی نے گل کے کٹوروں میں بھر دیا پانی

اسی نے چادِ خشکی زمین سے چھپینی      ہے اس کی سادگیوں میں غضب کی رنگینی  
 اسی نے گل کو سکھائی چمن میں رنگینی      اسی کے قطروں میں پنہاں ہے حُسنِ آیینی  
 سحابِ ثر کو برسنا سکھا دیا اس نے  
 گلوں کو باغ میں ہنسنا سکھا دیا اس نے

وجودِ لالہ و نسریں و نسترِ اس سے      جہاں میں آتشِ گلزارِ شعلہ زن اس سے  
 لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا چمن اس سے      بغیر رنگ ہے پوشاکِ یاسمن اس سے  
 اسی کے آب سے رونق بڑھی ہے گلشن میں  
 اسی نے آگ لگا دی چمن کے دامن میں

سکھائیں پھولوں کو مہرا نور دیاں، اس نے      شہیم گل کو دیں آوارہ گردیاں اس نے  
 خزاں کے چہرے سے دھوئی ہیں زردیاں اس نے      لباسِ باغ پہ کھولی ہیں فردیاں اس نے  
 گلوں کے بھیس میں قطروں کے ڈھنگ بدلے ہیں  
 خدا کی شان کہ پانی نے رنگ بدلے ہیں

اسی کے چودے پڑ ہیں بحار کے آغوش      اندھیری رات ہیں، ہے حکمراں اسی کا فردش  
 زبانیں موجوں کی چلنے لگی ہیں دوشِ بندوش      یہ سوزبانوں سے گویا ہے، اور کبھر خاموش  
 یہی وہ ہے کہیں اونچا ہوا اگر سر سے  
 تو اس کے فیض سے کشتِ عمل میں ہیں بر سے

فیوض پاتے ہیں مسلم بھی اور کافر بھی      ہے دامن اس کا مظہر بھی اور طاہر بھی  
 ہے ایک طرح سے باطن بھی اور ظاہر بھی      مقیم بھی ہے مثالِ نظرِ ماسر بھی

نگاہِ عقل میں رتبہ وسیع ہے اس کا

یہ بحرِ فیض ہے دامن وسیع ہے اس کا

وہ اپنا فضل و کرم صبح و شام کرتا ہے

وہ اپنی نعمتیں یونہی تمسام کرتا ہے

دو فوراً آب سے اک فیضِ عام کرتا ہے

وہ ایسی چیزوں کی قیمت حرام کرتا ہے

خیال اس کو ازل سے ہے نفعِ خلقت کا

اور آپ سمجھو ذریعہ ملاحظہ تجارت کا

جہاں کے واسطے سقا بنیں یہی نہریں

چلیں جبال کی چوٹی سے، منجلی نہریں

کریں فریضہ واجب میں کیوں کمی نہریں

زمین پر پھیل گئیں، دوڑتی ہوں نہریں

خود اپنی موجوں سے ہونے لگیں لجام بکف

کوئی ہے مشکِ بدوش، اور کوئی جام بکف

زمانہ کیسے ہو سیراب، کیسے نعمت پائے

جو پستیوں میں رہے، اوج پر وہ کیونکر آئے

مجال کس کی جو دریا کو آسماں پہ چڑھائے

یہ کس میں تاب کہ ساکن کو سیرکار بنائے

بحارِ حکم سے دنیا کے انقلاب بنے

پسینے ماتھے پہ آنے لگے، سحاب بنے

یہ طرفِ بحر کا آئینہ دار بن کے چلا

بڑھا جو سوزِ جگر تو بخار بن کے چلا

فلک کی سمت سفیرِ بخار بن کے چلا

ہوا کے دوش پر ابر بہار بن کے چلا

خزاں کے زور کو اک پل میں توڑ دیتا ہے

کسی کے حکم سے دامنِ پخوڑ دیتا ہے

سُبکِ مثالی ہوا، اور پھر گرانی ہے

سحابِ فیض کی اسٹھتی ہوئی جوانی ہے

جمالِ برق کو ہر لحظہ صوفشانی ہے

خدا کی شان کہ دامن کی آگ پانی ہے

ذرا سی چوٹ پڑی، دل کے دارغ جلنے لگے

اندھیری رات جو پانی چسراغ جلنے لگے

شبِ سیاہ کے پردے بڑھائے جاتا ہے

ہنسی سے برق کی خود مسکرائے جاتا ہے

ستارہ باریوں سے جگمگائے جاتا ہے      فلک کے تاروں کی دنیا چھپائے جاتا ہے

مثالِ چشمِ تننا کھلے ہوئے تارے

ہٹا جو ابر، تو نکلے ڈھلے ہوئے تارے

وہ رُوح پھونکی کہ مرے جلاہ ہے اس نے      بھڑک رہے تھے جو شعلے بجھا دیے اس نے

زمین پہ فیض کے دریا، بہا دیے اس نے      رُخ بہا سے، پردے اُٹھا دیے اس نے

گل اپنے جلوہ رنگیں میں مسکرانے لگے

زمین ہنسنے لگی، کھیت لہلہانے لگے

سنبھل نہ سکتے تھے، جم کر برسے والے ابر      ہوا کے دوش پہ، لیتے رہے سنبھالے ابر

زمین پہ پھینکتے تھے موتیوں کے جھالے ابر      وہ نیلی نیلی گھٹائیں، وہ کالے کالے ابر

فلک کی ابروؤں کی طرح، چڑھ گئے دریا

گھٹا کا زور گھٹا جب، تو بڑھ گئے دریا

جو چاہے وہ تو اثر کا میاں بنتا ہے      خدا ہی جانے کہ کیوں کر سحاب بنتا ہے

زمانہ ایک یوم انقلاب بنتا ہے      فلک پہ ابر، زمین پر گلاب بنتا ہے

نگاہِ عقل سے دیکھیں، جو حق کے دشمن ہیں

ہر ایک قطرہ میں پنہاں، ہزار گلشن ہیں

ترے وجود میں، اور شبہ اے خدا کی پناہ      تری عطا کو نہ سمجھے، تو عقل ہے گمراہ

زبان بن گئی گوپلِ حُسن میں، اے اکرام      کہا کہ أَشْفَعُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

سوئے سپہرِ کشش تھی غضب کی دامن میں

ہزاروں انگلیاں اٹھنے لگیں زمانے میں

تری عطاؤں پہ عقلِ سلیم کا اجسامان      تھا زیرِ دامنِ گردوں زمین کا مال و متاع

ہزاروں رنگ سے رنگے لگی فلک کی شعاع      کوزِ سجاجِ اُخْرَجَ شِدَائِدُهُ، فَيَجِبُ مِنَ الزُّرَّانِ

بنی تختیں سنبندہ جو بالسیاں ستمیں دانوں کی

مگر ٹھکانے لگیں محنتیں کسا نواری

سحابِ فیض جو برسا، تو بھر گئے جل تھل  
یہ انقلاب یہ تمہیں اور یہ رد و بدل  
یہ ناتوانوں میں قوت ہے دیکھو زورِ عمل  
طبق زمین کے اور توڑ دے ہری کوپل

کوئی قوی ہے ضعیفوں کے ساتھ ساتھ ضرور

نمو کے پردے میں پنہاں ہے کوئی ہاتھ ضرور

غبار میں ہے، مگر دل ہے صاف دانے کا  
ہے گردِ کعبہ قدرت طواف دانے کا

اتار لیتا ہے کوئی غلاف دانے کا  
شگافِ خامہ کن ہے شگاف دانے کا

زمین پہ کوششیں قطروں کی کامگار ہوئیں

ملاجو خاک میں، سرسبزیاں نشا رہوئیں

ترے کرم کے تصدق تری عطا کے نثار  
تھا تیرا حکم، جب ہی نامیہ تھی برسبر کار

زمین کی گود میں لیں کروٹیں ہزاروں بار  
اُس ایک دانے سے پورا شجر ہوا تیار

کھلا نہ رازِ درون ایسے پردہ دار طے

کسی کو پھول ملے اور کسی کو خار طے

کسی کو برگ دیے اور کسی کو برنجشا  
اسے اثر نہ دیا، اور اُسے اثر بنشا

اسے بنا دیا محسوس، اُسے شمر بنشا  
خلش کسی کو عطا کی، کسی کو زربنشا

کسی کے کان میں شبلم کو گوشوارہ کیا

کسی کے دامنِ نازک کو پارہ پارہ کیا

کوئی ہے خشک چمن میں، کوئی تر و تازہ  
کسی کے حُسن کا، اونچا فلک سے آوازہ

کسی کا رنگ ہے پھیکا، کوئی ہے پرغازہ  
سُجھکتا رہا ہے کوئی شاخ کج کا خمیازہ

نہ انتقام کسی نے علی الرُّؤس لیا

بڑے درختوں نے چھوٹوں کا خون چوس لیا

ترقیات ہیں اسی میں یہ رازِ فطرت ہے  
اصولِ خاص پہ مبنی، ہر اک حقیقت ہے

برت رہا ہے اسے وہ جو ربِّ قدرت ہے  
نہ اس میں ہے کوئی شکوہ، نہ کچھ شکایت ہے



فنا کے دور سے گزرے رہ نبات ملی  
ہزاروں بار سے، تب کہیں حیات ملی  
جو اس نے پائی مسرت تو اس کو غم بخشا  
کسی کو دامن بھر، اور کسی کو کم بخشا  
کسی کو کر دیا بھجان، کسی کو دم بخشا  
کسی کو دے دیا زائد، کسی کو کم بخشا  
کھیلنے کے راز نہ انسان سے مشیت کے  
نہی سمجھ لو تصرف ہیں مالکیت کے  
فدا جاد ہوا، تب کہیں نبات بنی  
نبات ارض سے حیاں کی کائنات بنی  
ہو ایہ ندیہ، تو پھر آدمی کی ذات بنی  
بغیر اس کے نہ دنیا میں کوئی بات بنی  
ہر ایک وقت میں اور رنگ، ماہیت بدلے  
تغییرات ہوئے رنگ ماہیت بدلے  
جہاں میں منزلِ آخر جاد کی ہے بشر  
اب اس کے ہاتھ میں ہے اختیارِ خیر و شر  
ادھر زمیں پہ، ادھر ہے فلک پہ اس کی نظر  
تنزلی اور ترقی میں دونوں ہیں رہبر  
یہ چاہے خاک بنے، یا فلک پہ چڑھ جائے  
ترقیوں جو کرے، تو ملک سے بڑھ جائے  
تغییرات ہوئے، اور کوئی غم نہ ہوا  
لبوں پہ آیا کسی کے نہ ایک بھی شکوہ  
کبھی نہ اس کے لیے آدمی کا دل ٹرپا  
خرد نے دیکھ لیا، اور حاسہ نے سنا  
یہ جان دیتی ہے اور جان بنتی جاتی ہے  
نبات ندیہ حیوان بنتی جاتی ہے  
نبات ارض ہے بھجان، یہ نہ ہو دوسواں  
ہے اس میں روح نباتی، اسے بھی ہے احساس  
ہے دستوں سے اسے اُنس دشمنوں سے ہر آن  
فلک کا دیکھتی ہے منہ لگائے رہتی ہے آس  
کب اس کو ظلم کفِ دہر سے ملا نہ کیا  
ہزاروں سختیاں جھیلیں، مگر گلانہ کیا  
سہ سر جگدیش بوس ماہر نباتات نے اس حقیقت کو سائنس سے ثابت کیا ہے۔

نظام دن اور رات سے سبق سیکھو ہر ایک ذرہ کی ہر بات سے سبق سیکھو  
نظام دہر کے آیات سے سبق سیکھو خموش رہ کے نباتات سے سبق سیکھو

بغیر سمجھے ہوئے، منہ سے کچھ کہنا نہ کرو  
مشینوں کا نہیں علم، تو گلا نہ کرو

تھا ظرف جتنا بھی جس کا، اُسے وہی بخشا ہنسی گلوں کو ملی، اُس کو مسلا رونا  
کہیں ہے روکش تقدیر، بیچ سنبل کا دل بہار میں اُترا ہوا کہیں کانٹا  
کسی کو رنگ دیا، اور کسی کو بوجھشی  
صدف میں قطرہ نیساں کو آبر و بخششی

غذا جو پسکھڑیوں کی ہے، وہ شجر کی نہیں کہ جذبِ اصل کی مقدار فرعِ ترک کی نہیں  
جڑوں کی ریشہ دوانی ہے جو، شجر کی نہیں ہے اُس کے ہاتھ میں تقسیم اپنے گھر کی نہیں  
کھن پیہ یہ ہوا قشاق، تو اُس کو بیش دیا  
کسی کو نوش دیا، اور کسی کو نیش دیا

حکیم وہ ہے، تو مجمل کیا مفصل کو سپیدی برق کو دی اور سیاہی بادل کو  
کھلاؤ دشت کو بخشا، گھناؤ جنگل کو سمائی اپنے میں پیدا کرو، نہ یوں چھلکو  
نگاہِ عقل سے، قدرت کے صرف کو دیکھو  
شکایتیں نہ کرو، اپنے نظر کو دیکھو

محلِ شکوہ نہیں، یہ نظامِ عالم ہے خرد فریب یہاں انتظامِ عالم ہے  
کسی کے دستِ قضا میں زمامِ عالم ہے نئے ہیں طرز، عجب صبح و شامِ عالم ہے  
کسے سنبھا لوگے، جب خود سنبھل نہیں سکتے  
چراغِ عقل اس آندھی میں جل نہیں سکتے

## سلاہ

راستہِ حق کا ہوا ہی کرتا ہے اکشر نیا دیکھنا دیوارِ کعبہ میں بنا اک در نیا  
روکشِ جنت ہے اشکِ غم سے روئے مومنین آنکھوں ہی آنکھوں میں پیدا کر لیا کوثر نیا

آنے دو مسراج کی شب بڑھے دو شوقِ صال  
 رکھ چکے ہیں پاؤں بچپن میں جوانی کی طرح  
 دیکھے دو شہ رسالت پر امامت کا عروج  
 حاملِ رایت تھے کہنہ مشق پلٹے بار بار  
 حق پر تکیہ فریش احمد شامِ حجت اور علیؑ  
 خم کا میداں، دستِ مرسل، جامِ تلخ، دورے  
 جھریوں میں رخ کی چمکا خطِ تقدیر حبیب  
 فاطمہ آئیں عدالت خواہ جن کزیر عرش  
 نوکِ نیزہ پر بھی مشغولِ تلوت ہیں حسینؑ  
 کانپتے ہاتھوں پر لے جاتے ہیں بچے کو حسینؑ  
 ننھی سی تربت میں رکھ کر لاش کو بے شیر کی  
 بھائیوں کو سنا منے کٹوا کے رخصت کے لیے  
 رو رہا ہوں غم میں شہ کے کھلتے ہیں خمواں کے بچوں

راستہ کر لے گا پیدا گنبدِ بے درنیا  
 کب علیؑ کے واسطے ہے دو شہ پنمبر نیا  
 آج کعبہ میں مؤذن ہے نیا، منبر نیا  
 اب فاتح توڑھونڈتا ہے قلعہ خیبر نیا  
 سونے والا ہے نیا، تکیہ نیا، بستر نیا  
 میرا میخانہ نیا، ساتی نیا، ساغر نیا  
 غل ہوا، تخریر قسمت ہے نئی، مسطر نیا  
 اور پُر پا ہو گیا محشر میں اک محشر نیا  
 معجزہ دکھلا رہا ہے یہ سرِ سرور نیا  
 دستِ اطہر پر بنا گوارہ اغشتر نیا  
 شہ نے فرمایا کہ بیٹا ہو مبارک گھر نیا  
 راستہ کرتا ہے پیدا بازوے سرور نیا  
 آج کے دن سے مبری جنتِ نئی کو شرنیا

سب کیا کرتے ہیں، اے محبوبِ ابدِ شہ مگر  
 جب اٹھاتے ہو قلم تم کہتے ہو اکشر نیا

رباعی

کشتی طاعت کی کھینے والے نہ رہے  
 اللہ کے حق کا ذکر کیا دنیا میں  
 خالق سے جزا کے لینے والے نہ رہے  
 بندوں کے حقوق دینے والے نہ رہے

## بگٹ عظیم آبادی، غلام دستگیر خان

پٹنہ کے ایک متوسط الحال، زمینداری پیشہ پٹھان خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد عبدالکریم خان (عرف میاں خان صاحب) تھے۔ بگٹ ۱۹۰۳ء میں اپنے آبائی مکان واقع محلہ لودی کڑہ (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ رسمی تعلیم دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ امتحان ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ پٹنہ ہائی اسکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد اگرچہ کالج میں داخلہ تو لیا، لیکن حالات کی نامساعدت کے باعث یہ سلسلہ چل نہ سکا۔ دو سال بعد ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت مل گئی۔ اس میں بھی کوئی خاص ترقی نہ کر سکے؛ جب پنشن پر سبکدوش ہوئے ہیں، تو سٹریٹیکٹ آفس میں ہیڈ اسسٹنٹ تھے۔

شعر سے دلچسپی تعلیم کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ کلام پر اصلاح غالباً پرویز شاہدی (ف مئی ۱۹۴۸ء) سے لی۔ جب موصوف ۱۹۳۵ء میں کلکتے چلے گئے، تو سید جمیل مظہری کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ کلام میں، جیسا کہ تخلص سے عیاں ہے، مزاج کا پہلو غالب ہے۔ دورِ حاضر کے سیاسی اور معاشی مسائل پر طنز اور استہزاء ان کا خاص حصہ تھا۔ افسوس کہ کوئی مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو عید الفطر کا دن گزار کر سیر شام رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔ عارضہ دل کا شکار ہوئے۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادی اور دوسری سے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔

بہت مشکل سے ان کے چند شعر ملے ہیں، وہی بطور نمونہ ذیل میں درج کر رہا ہوں؛

## رباعی

چینی کی ہے بڑھتی ہوئی قیمت، بگٹٹ! . . . بازا میں گزرتی تھی ہے قلت، بگٹٹ! .  
 کیا کروں یار سے تلخ کلامی کا گلہ! . . . پھیکا ہی ملا وصل کا شربت، بگٹٹ! .  
 ہے خرچ کی چیز، پان کھانا چھوڑو . . . بجلی ہونٹوں سے اب گرانا چھوڑو .  
 جاسوس محلے میں بہت ہیں، بیگم! . . . لگ جائیگا ٹیکس، مسکرانا چھوڑو .

## قطعہ

سمجھ میں کچھ نہیں آتا محبت کس کو کہتے ہیں  
 نتیجہ یہ نکلتا ہے، جو ہم ریسرچ کرتے ہیں  
 یہ اک واٹر ہے جس میں ہے کرنٹ اے سی ڈی سی کا  
 کسی سے ہٹ کے مرتے ہیں، کسی سے سٹ کے مرتے ہیں

## غزل

بھوک میں رخصت تبسم ہو گیا . . . میں شہید ہجر گندم ہو گیا  
 خط میں کچھ مانگا تھا گہوں یار نے . . . نامہ برجا کر کہاں گم ہو گیا  
 ملے ملے رہ گیا کل یار سے . . . بوسہ امریکا کا گندم ہو گیا  
 شاپ پر راشن کے اتنی بھیر تھی . . . یار سے میرا تصادم ہو گیا  
 ملک میں کچھ کم نہ تھا غلہ، مگر . . . سینٹر جی کے توند میں گم ہو گیا

عشق میں اپنا پرویشن ہوا  
 ان کا بگٹٹ آپ سے تم ہو گیا



## ابراہیم گنوری، احمد بخش

سٹی ۱۸۹۸ء میں یوپی کے پرانے تاریخی قصبے گنور (ضلع بدایون) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ نبی بخش ایک متوسط الحال کاشتکار تھے اور یہی ماحول انہیں بھی ملا۔ والد کا انتقال ان کی کسینی میں ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کا بار ان کی والدہ (محبوب النساء بیگم) کے کندھوں پر آ پڑا، جسے اس حوصلہ مند خاتون نے بڑے سلیقے سے اٹھایا۔

تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق، مقامی مکتب سے شروع ہوئی۔ یہاں اردو کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ قرآن بھی پڑھا۔ پھر ۱۹۱۴ء میں گنور کے مڈل اسکول سے آٹھویں درجے میں کامیاب ہوئے۔ گھر کے ناسازگار حالات کے باعث مزید تعلیم ممکن نہیں تھی، اس لیے انہوں نے ملازمت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، اور کانپور کے مشہور جوتوں کے سرکاری کارخانے میں ملازم ہو گئے۔

اس زمانے میں منشی سخاوت حسین سخا، جہاں پوری بھی اسی کارخانے میں ملازم تھے۔ ابرصاحب نے اگرچہ شعر گوئی ۱۹۱۵ء میں اپنے قیام گنور کے زمانے ہی میں شروع کر دی تھی، لیکن اب تک کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ یہاں کانپور میں ان کی سخا سے ملاقات ہوئی، تو یہ ان سے مشورہ کرنے لگے۔ اس لیے کہنا چاہیے کہ ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ ابر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرا ایک کاروباری معاملے میں سخا سے اختلاف ہو گیا تھا، جس کے بعد ان سے اصلاح کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حقیقت اس سے زیادہ ہے۔ ہوا یہ کہ جب ٹریننگ کالج کی سند لے کر ابر صاحب قادری باغ کے (جسے اب چمن پور کہتے ہیں) پرائمری اسکول میں مدرس ہوئے، تو یہاں ان کی راز سہسوانی سے اکثر ملاقات

رہنے لگی، جنہیں وہ پہلے سے جانتے تھے۔ رازشعر میں سید علی حسن، حسن مارہروی (ف ۱۹۳۰ء) کے شاگرد تھے جیسا کہ سب کو معلوم ہے، حسن خود داغ (ف ۱۹۰۵ء) کے ممتاز شاگرد اور ان کے نورتوں میں شامل تھے۔ اس زمانے میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں سینیئر لیکچرر تھے۔ راز کی ترغیب پر ابرصاحب نے حسن کا تلمذ اختیار کر لیا۔ تلمذ کا یہی تعلق ان کے اپنے تخلص کے ساتھ حسنی کی نسبت کے مستقل اضافے کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد سخا شاہجہان پوری سے اصلاح لینا بند کر دی۔

تقریباً چار برس کی ملازمت کے بعد ابرصاحب کا پورے گنور واپس آگئے چونکہ وہ جفت سازی کے کارخانے میں تین چار سال کام کر چکے تھے، انھوں نے خیال کیا کہ وہ اس کاروبار کے ماہر ہو گئے ہیں۔ اسی غلط فہمی میں انھوں نے یہاں وطن میں جوتوں کی دکان کھولی۔ یہ تجربہ بالکل ناکام رہا۔ گنور میں انگریزی جوتے (بوٹ) کا رواج ہی نہیں تھا، سب لوگ مقامی ساخت کا نری کا جوتا پہنتے تھے۔ لیکن اس سے بھی بڑی مشکل یہ تھی کہ کسی کو جوتا تیار کرتے دیکھنا، ایک بات ہے اور خود جوتے بیچنا، بالکل دوسری؛ دونوں کا بھلا آپس میں کیا تعلق! نتیجہ یہ نکلا کہ تجارت کا تجربہ نہ ہونے کے باعث سال بھر میں ساری پونجی کھو بیٹھے۔

اب انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ مولانا حکیم عبدالحکیم کامل گنوری سے فارسی اور عربی پڑھنے لگے۔ فارسی انھوں نے مولوی رفیع احمد عاتقی بدایونی (پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے والد) سے بھی پڑھی۔ تیاری کے بعد اردو اور فارسی کے امتحان پاس کیے۔ عرض، ان اسناد کے بل بوتے پر انھوں نے محکمہ تعلیم کا دروازہ کھٹکا کھٹایا اور احباب کی سفارش سے انھیں ڈسٹرکٹ بورڈ میں تعلیمی نوکری مل گئی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ ضلع بدایوں کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، اگرچہ اس میں کا زیادہ زمانہ خاص بدایوں شہر میں گزرا، جہاں وہ ۷ سال رہے۔ اسی باعث وہ بدایوں کو اپنا "وطنِ ثانی" کہا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا، اور اسی کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات بھی آئے، جن سے

ملک کا امن تباہ ہو گیا۔ ابرصاحب اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر رامپور چلے گئے یہاں ان کے شاگرد سید محسن علی حشر ریاست کے محکمہ تعلیم میں آفس سپرنٹنڈنٹ کے ذمہ دار عہدے پر متمکن تھے۔ انھیں کئی دسالت سے ابرصاحب کے داماد افسر حسین افسر گنٹوری اور بڑے صاحبزادے طریقت حسین تالبش پہلے سے رضائیکھٹا آل کارخانے میں ملازم ہو کر رامپور جا چکے تھے۔ اب حالات سے مجبور ہو کر ابر بھی اپنے بیٹے کے پاس رامپور پہنچے جہاں ابرصاحب کو معلوم ہوا، تو انھوں نے فوری طور پر انھیں ایک شبینہ اسکول میں ملازم کرادیا؛ پھر مناسب کارروائی مکمل کر کے مدرسہ عالیہ (اورنٹیل کالج) میں ۷۵ روپے مشاہرے پر جگہ دلوا دی۔ رامپور میں پانچ برس رہے؛ اور وہاں سے ۱۹۵۳ء میں سبکدوش ہو کر گنٹور واپس چلے آئے۔

جب سید احسن مارہروی کا اگست ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا ہے، تو انھوں نے گنٹور میں استاد کے نام پر ”بزم احسن“ قائم کی تھی۔ وہ خود اس کے صدر تھے۔ اس بزم کے زیرِ اہتمام وہ مشاعرے وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ اب رامپور آنے کے بعد انھوں نے استاد گرامی کی یاد میں اپنے استاد بھائی صغیر حسنی مظفر نگری کے اشتراک سے ماہنامہ احسن جاری کیا۔ اس کا اس زمانے کے موقر پرچوں میں شمار ہوتا تھا۔ جب تک رامپور رہے، احسن بھی شائع ہوتا رہا؛ ان کے ترکِ رامپور کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔ یوں بھی یہ گھائے کا سودا تھا، تو ان کے شاگرد اور احباب چندہ جمع کر کے پورا کرتے رہتے تھے۔

رامپور سے واپس آنے کے بعد انھوں نے بسراوقات کے لیے آبائی پیشہ کاشتکاری اختیار کیا۔ ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ آئندہ شاگردوں کو اپنے کلام پر اصلاح کے لیے کچھ نہ کچھ پیش کرنا ہوگا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم ہر ایک خدمت کے لیے کام کرنے والوں کو اجرت دیتے ہیں؛ بازار سے کوئی چیز خریدتے ہیں، تو اس کی بھی قیمت ادا کرتے ہیں۔ استاد بھی کلام کی اصلاح میں اپنا وقت خرچ کرتا ہے، اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں سے شاگرد کی تربیت کرتا ہے؛ پس اسے معاوضے سے کیوں محروم رکھا جائے؛ اس کے علاوہ باہر کے مشاعروں میں بھی ان کی بہت مانگ تھی؛ اور اس سے بھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ مزید برآں ۱۹۴۳ء

میں یوپی حکومت نے ان کا چھ سو روپے سالانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا۔ غرض یہ کہ اگرچہ اب وہ کہیں ملازم نہیں تھے، لیکن مادی پہلو سے انہیں کسی پریشانی کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی، ان کے ذاتی خرچ کے لیے ان کے پاس کافی وسائل تھے، بلکہ اپنی محتاط زندگی اور حد درجہ کفایت شعاری کے باعث وہ یقیناً کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کے قابل رہے ہونگے۔

گنور میں وہ اپنی دو خردسال پوتیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ۷ نومبر ۱۹۷۳ء شب کے کھانے کے بعد وہ حسبِ معمول اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اگلی صبح (۸ نومبر) جب وہ دیر تک باہر نہیں نکلے، تو تقریباً آٹھ بجے ان کی بڑی پوتی ان کے کمرے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ خون میں لت پت مُردہ پڑے ہیں۔ شب میں انہیں کسی نے قتل کر دیا تھا۔ قتل کا سبب معلوم نہ ہو سکا، نہ قاتلوں ہی کا کوئی سراغ ملا۔ لاش اسی دن پوسٹ مارٹم کے لیے بدایون گئی۔ جنازہ اگلے دن یعنی ۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو اٹھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں گنور میں پرانی سرانے کی پشت پر آبادی کے قریب کچھ زمین اپنے خاندانی قبرستان کے لیے خریدی تھی، اس کا نام ”گلستانِ جاوید“ رکھا تھا، اسی میں دفن ہوئے۔

ان کی ۱۹۱۹ء میں ایکری (ضلع بدایون) میں شادی ہوئی تھی۔ چار بیٹے (طریقت حسین، ودیعت حسین، عرف مناظر حسین)، نرہت حسین، غنی باقر عرف اچھن میاں) اور ایک بیٹی (مدینہ بیگم) ان سے یادگار ہیں۔ مدینہ بیگم اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھیں۔ چاروں بیٹے یہیں ہندستان میں رہے اور سب خوش و خرم ہیں۔ بیوی (عائشہ بیگم) کا انتقال ان سے سال بھر قبل ۲۸ نومبر ۱۹۷۲ء کو ہو گیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج میں ابراہیم کی خدمات بہت قابلِ قدر رہی ہیں۔ ان کے سینکڑوں شاگرد ملک کے دور دراز خطوں تک میں ملتے ہیں، اور وہ اپنی اپنی جگہ اردو کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔

ابرمذتوں مشہور تعلیمی ماہنامے ”رہنمائے تعلیم“ کے ادارہ تحریر میں بھی شامل رہے۔ ان کی فنی اور لسانی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اس سلسلے میں ان کی سیما بابر آبادی (فس ۶۱۹۵۱) سے چیقلش قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے سیما بابر صاحب کی کتاب دستور الاصلاح،



میں درج شدہ تمام اصلاحوں کا تفصیلی جائزہ لیا تھا، جو رہنمائے تعلیم میں تقریباً تین برس قسط وار شائع ہوا۔ یہ مضامین کتابی صورت میں اصلاح الاصلاح کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔

اسی نوع کا دوسرا مناقشہ نیاز فتحپوری سے پیش آیا تھا۔ نیاز نے کسی زمانے میں 'بالہ و ما علیہ' کے عنوان کے تحت نگار میں مختلف اساتذہ کے کلام پر تنقید لکھنا شروع کی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے احسن مارہروی کے کلام کو بھی لے لیا۔ ابراہینے استاد کے عاشق تھے؛ قدرتاً انھیں یہ تنقید (بلکہ تنقیص) بہت ناگوار گزری، انھوں نے استاد کی حمایت میں نیاز کے اعتراضوں کا جواب دیا۔ نیاز بھی بلائے بے درماں تھے، اور ان کا مبلغ علم و فن بھی ابر سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ سلسلہ بھی بہت دن چلا۔

ابری کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ان کی تبدیلی مذہب ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شروع میں قرآن پڑھا۔ مدتوں نعت اور منقبت لکھنے رہے؛ ان کا ایک دیوان (شبیئے) اسی صنعت کلام کا مجموعہ ہے۔ لیکن بعد کو وہ بہائی ہو گئے۔

تصانیف میں ہے کہ جس زمانے میں ابر صاحب گنور میں مقیم تھے، ایک صاحب بلاک ڈیولپمنٹ کے محکمے میں ملازم ہو کر جھاؤنی تحصیل گنور آئے۔ ابر کا ان کے ہاں آنا جانا ہو گیا۔ وہاں ان کے والد ارٹھی حسین عابدی سے ملاقات ہوئی۔ عابدی صاحب بھی تعلیمی ملازمت میں رہے تھے، اور پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ مذہباً بہائی تھے۔ ابر صاحب کی ان سے صحبت رہنے لگی، جس میں لامحالہ مذہب پر بھی گفتگو ہوئی۔ اسخیں کی ترغیب و تشویق پر اور اثر کے تحت ابر نے بھی بہائی مذہب اختیار کیا۔

ان کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

- (۱) اصلاح الاصلاح (راپور ۱۹۲۹ء)؛ (۲) شبیئے: نظیں (راپور ۱۹۵۲ء)؛ (۳) نیگنے؛
- غزلیات (راپور ۱۹۵۲ء)؛ (۴) میری اصلاحیں: دو حصے (دلی ۱۹۵۴ء؛ ۱۹۶۶ء)؛ (۵) قرینے: غزلیات، (جالندھر ۱۹۶۳ء)؛ (۶) شبیئے: حمد و نعت و سلام (دلی ۱۹۶۶ء)؛ (۷) خزینے: غزلیات، نظیں، متفرقات (دلی ۱۹۶۹ء)۔ بہت سا کلام ہنوز زیور طبع



سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس میں غزلیات اور منظومات کے علاوہ ایک پورا مجموعہ بہائیت سے متعلق بھی ہے۔

ابراہیم کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جو کچھ اساتذہ سے سیکھا، وہ تو تھا ہی، اس پر انہوں نے عمداً اپنے آپ کو متروکات کی ایک لمبی فہرست کا بھی پابند بنا لیا تھا، جن میں سے بعض معقول ہیں، بعض غیر ضروری؛ بہر حال وہ ان پر قائم تھے۔ ان کے استاد احسن مارہروی فن شعر کے پورے ماہر تھے؛ ابرہ نے یہ ان سے حاصل کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فن اور زبان کے پہلو سے ان کے کلام میں کوئی سقم نہ رہا۔ وہ ایک دیندار مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس لیے وہ کسی عریانی اور بے ہرادی کے روادا نہیں ہو سکتے تھے۔ بہائی مذہب اختیار کیا، تو وہاں بھی اخلاق کی پابندی جوں کی توں قائم رہی۔ غرض ان کے ہاں آپ کو اخلاق اور تہذیب سے فروتر کوئی شعر تلاش کرنے پر بھی نہیں ملیگا۔

ان کے مطبوعہ سے قدرِ اول کے اشعار کا اچھا انتخاب تیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مجموعے آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں، اس لیے نمونے کے طور پر چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں:

وقت خود مانوس کر دیتا ہے، اے تازہ اسیرا      چند دن رہے، نفس بھی آسیاں ہو جائیگا  
ہم سے تو اپنا قصہ غم، غمیر کی طرح      عنوان بدل بدل کے سنایا نہ جاسیگا  
جامہ دوزی مری وحشت میں کوئی کیا کرتا      آستیں سل نہ چکی تھی کہ گریبان نکلا  
جس کو میں بھی کہ نہ سکوں، جس کو وہ بھی سن نہ سکیں

حال وہیں تک آ پہنچا، درد بھرے افسانوں کا

آپ تو خیر دوست ہیں، دل سے بھی دشمنی نہ تھی      اب یہ خدا کو علم ہے، کس نے مجھے مٹا دیا  
حرم میں، دیر میں، کیا فرق ہے، یہ کم نظر دیکھیں      ہمیں تو جستجو سے واسطہ رکھنا، جدھر جانا  
بلا سے برق کو ندے، آگ بر سے، آندھیاں آئیں      ہمیں اے ابراہیم چھوڑ کر اپنا کدھر جانا

ہراک دھڑکن سے دل کی دوست کا مجھ کو پیام آیا

مجت میں خداے آرزو! یہ کیا مقام آیا

بہت سے مرحلے کرنے پڑے طے کوئے جاناں میں  
 کبھی بیتِ الصنم آیا، کبھی بیتِ اکرام آیا  
 لکھ رہا ہوں نامہ شوق ان کو یوں  
 جیسے آہی جائیگا اس کا جواب  
 مجھ کو جلووں کی، ان کو نظر کی طلب  
 عشق کبھی تشنہ لب، حسن بھی تشنہ لب  
 غالباً آگے دن فصلِ بہاراں کے قریب  
 ہاتھ رک جاتے ہیں آ آ کے گریباں کے قریب  
 دیے آئی ہے موت غم سے نجات  
 کس کو ملتا ہے اب مزاجِ حیات  
 روز ہوتے ہیں راہبر پیدا  
 روز لگتے ہیں کاروانِ حیات  
 نہ سنبھالے جنونِ عشق اگر  
 عقل برباد کر چکی تھی حیات  
 مل نہیں سکتی غم سے نجات  
 عمرِ محبت تا بہ حیات  
 داغِ الفت دل میں، جلوے آنکھ میں، سر میں جنوں  
 ایک دنیا لے کے اٹھے ہیں تری محفل سے ہم

ہم نے جہانِ عشق میں کاٹی ہے زندگی ، آگاہ شام سے ہیں، نہ واقف سحر سے ہم  
 یہ بارہا ہوا ہے کہ ان کے خیال میں ۰ رُودادِ ہجر کہتے رہے بام و در سے ہم  
 نام ان کا سن کے یوں کھوئے کہ ہر اک پا گیا جب کبھی بہکے ہیں، بہکے ہیں اسی منزل سے ہم  
 آغازِ محبت کے انجام کو کیا کہیے جب درد کا شکوہ تھا، اب جان کے لالے ہیں  
 دل میں ہے سوزِ عشق تصور میں۔ یہ حسنِ دوست دوزخ ہے میرے سینہ میں، جنتِ نگاہ میں  
 سجدوں سے لاکھ در کے ایسے مل گئی نجات سرجس کا آ گیا ترے در کی پناہ میں  
 میرے مرنے کا موت پر الزام کام جس کا ہے، اس کا نام نہیں

عزیز اس سے تو ہم نے دین و ایماں بھی نہیں رکھا  
 اب آگے جو کچھ آئے بیوفا کے دین و ایماں میں  
 مرے نالوں کا کیوں چسرا کہ میں تو ایک انساں ہوں  
 پڑیں چوٹیں، توڑتے ہیں شرارے سنگ و آہن سے

تڑپا گیا نفس میں چمن کا دھواں مجھے بجلی کہیں گری ہے، ہوا ہے اثر کہیں  
 ہستی میں میری عشق میں ڈالے ہیں تفرقہ میں ہوں کہیں، خیال کہیں ہے نظر کہیں

اہلی خرد کی وحشت دیکھو دیوانہ تو پھر دیوانہ  
 فسانہ میرا سن لو آج، ورنہ سونگے گل یہ دنیا کی زباں سے  
 تم یاد بھی رکھو گے، ستم بھی نہ کرو گے اس کا بھی یقین ہے مجھے، اس کا بھی یقین ہے  
 فسانہ زندگی کا یوں بھی کم دکش نہ تھا، لیکن لگے چار چاند اور اس میں عنوانِ محبت ہے  
 اک ترا لطف، ایک تیرا ستم میری موت و حیات کچھ بھی نہ تھی  
 صرف حسنِ خیال تھا میرا نگہ التفات کچھ بھی نہ تھی  
 دل کو تڑپ کے سہام لیا ہے کبھی کبھی یوں بھی تمہارا نام لیا ہے کبھی کبھی  
 بادل میں بجلی بہرائی کس کا فرنی لی انگریزانی  
 دکھنے لگا دل سرد آہوں سے اُبھری چوٹ، چلی پروائی

ترے سوزِ بھرنے پھونک دی چینِ مراد کی ہر کلی

فقط ایک شاخِ دناہی تھی جو بہ فیضِ عشق ہری رہی

غم سے گھبرا کر آہ کون کرے! عشق میں یہ گناہ کون کرے!  
 آپ سے رسمِ وراہ کون کرے! عمر بھر آہ کون کرے!  
 پُرسکوں فقر کے بھی لالے ہیں طلبِ عز و جاہ کون کرے!  
 محو ہوں درد کی لطافت میں کس کو فرصت ہے آہ کون کرے!  
 ان کی نظریں جدھر، ادھر دنیا میری جانب نگاہ کون کرے!  
 ترکِ اُلفت، اسے معاذ اللہ! اپنی ہستی تباہ کون کرے!

سب مسرت طلب ہیں دنیا میں

ابراہیم سے تباہ کون کرے!

## سلام مچھلی شہری، عبدالسلام

یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو مچھلی شہر ضلع جونپور کے محلے مولویانہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کا متوسط الحال خاندان پشتوں سے مقیم تھا۔ خاندان میں علمی روایت تھی۔ چنانچہ ان کے جدِ امجد مولوی محمد امین جونپوری کی عالم حدیث کی حیثیت سے خاصی شہرت ہے۔ اس کے باوجود سلام کے والد محمد عبدالرزاق نے کپڑے کا کاروبار اختیار کیا۔ وہ بمبئی سے بکنسی پر مال منگواتے اور اسے مچھلی شہر اور مضافات میں فروخت کرتے تھے۔ محمد عبدالرزاق صاحب چاہتے تھے کہ بیٹا علوم دین میں فاضل بنے؛ چنانچہ عبدالسلام کو پہلے قرآن حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ اردو مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۵ء میں آنکھوں درجے کا نتیجہ اتنا اچھا رہا کہ سرکاری وظیفہ ملا۔ اب یہ فورس ہائی اسکول، فیض آباد میں آگئے، لیکن دسویں کے امتحان میں ناکام رہے۔ یہ امتحان انھوں نے بعد کو ۱۹۳۹ء میں پرائیوٹ طور پر پاس کیا۔ باقاعدہ تعلیم اسی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ البتہ اس کے بعد اردو کے بعض امتحانات غیر رسمی طور پر پاس کر لیے تھے۔

وہ ابھی طالب علم تھے کہ نظم و نثر لکھنے لگے۔ بلکہ انھیں ایام میں انھوں نے ایک رسالے "نغمہ" کی ادارت بھی کی جو فیض آباد سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ انہوں نے یہ جلد ہی مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اس کے صرف پانچ شمارے شائع ہوئے (نومبر ۱۹۳۸ء، دسمبر ۱۹۳۸ء، جنوری ۱۹۳۹ء، فروری ۱۹۳۹ء، مارچ و اپریل ۱۹۳۹ء؛ مشترکہ شمارہ) اسی زمانے میں انھوں نے نظم میں متین مچھلی شہری (تلید داغ دہلوی) سے اصلاح لینا شروع کی۔ لیکن چونکہ دونوں کا مزاج بالکل مختلف تھا، جلد ہی یہ تعلق منقطع ہو گیا؛ لیکن بعض دوسرے

اصحاب کی طرح انہوں نے کبھی استاد کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا، نہ ان سے اصلاح لینے کے واقعے کو غلط بتایا۔

۱۹۳۹ء میں انہوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ ”میرے نغمے“ کے عنوان سے مرتب کیا؛ یہ اگلے برس ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ اس میں کلام دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ ”پھول“ تھا، جس میں رومانی اور جذباتی نظمیں اور گیت تھے؛ دوسرے حصے ”انگارے“ میں غالباً سیاسی موضوع کی منظومات تھیں۔ اردو سوسائٹی لکھنؤ (ناشر) کی ایک تحریک سے جو کتاب کے آخر میں چھپی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے ہنگامی حالات کے پیش نظر انہوں نے ان سیاسی نظموں کو کتاب سے حذف کر دینا قرین مصلحت خیال کیا۔ افسوس اس امر کا ہے کہ بعد کو بھی یہ کہیں شائع نہ ہوئیں اور بنگال غالب شائع ہو گئیں۔

ملازمت کا آغاز الہ آباد یونیورسٹی کے کتابخانے سے ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں یہاں کے مشرقی شعبے میں کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق پہلے سے تھا، اس ملازمت نے اس پر جلا کی؛ یہاں انہیں اپنی معلومات اور قابلیت کے بڑھانے کے مواقع پیش آئے۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے، اور شروع میں اس کے لکھنؤ دفتر میں کام کرتے رہے۔ انہیں ایام میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے اردو سائے ”مغرب“ کے مدیر اعزازی مقرر ہوئے تھے۔ لکھنؤ میں آٹھ برس تک کام کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں ان کا سرینگر تبادلا ہو گیا؛ یہاں ان کے ذمے فیچر لکھنے کا کام تھا۔ چونکہ یہاں وہ عارضی مستعار خدمت پر آگئے تھے، اس لیے میعاد کے ختم ہونے پر لکھنؤ واپس چلے گئے، اور بالآخر تباہی بردہٹی چلے آئے۔ یہاں شروع میں اردو مجلس کے شعبے میں رہے؛ آخری ایام میں ”اردو سروس“ میں پروڈیوسر کے عہدے پر فائز تھے۔

دہلی کے قیام کے زمانے میں ان کی کئی چیزیں شائع ہوئیں۔ دوسرا مجموعہ ”کلام“ دو سقین“ بکچر اردو لاہور نے شائع کیا، جو ترقی پسند مصنفین کی کتابیں شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش تھا۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی سے گیتوں کا مجموعہ ”پائل“ ساتی بکچر پو



نے پیش کیا۔ اسی دور میں ایک ناولٹ "باز و بند کھل کھل جائے" لکھنؤ میں چھپا۔ ۱۹۶۵ء میں انجمن ترقی اردو ہند اعلیٰ گڑھ نے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ ۱۹۷۳ء کے یوم جمہوریت کے موقع پر انھیں ادبی خدمات کے اعتراف میں "پدم شری" کا اعزاز دیا گیا تھا۔

انھیں بھی اپنے کئی ہمعصروں کی طرح مینوشی کی بُری لت تھی۔ اس نے ان کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا۔ وسط ۱۹۷۳ء میں صحت بہت خراب ہو گئی، تو اسپتال میں داخل ہوئے۔ علاج معالجے سے حالت کچھ رُوباصلاح ہوئی، تو واپس مکان پر آ گئے۔ لیکن طبیعت اچانک پھر خراب ہو گئی۔ بظاہر وہ شدید یرقان کے مریض تھے۔ اب ڈاکٹروں نے جگر پر عمل جراحی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۳ نومبر کو آپریشن ہوا، تو کھلا کہ انھیں جگر کا کینسر ہے۔ اس کے بعد وہ پورے ہوش میں ایک دن بھی نہیں رہے۔ اسی حالت میں ۱۹ نومبر (۱۹۷۳ء) صبح پونے آٹھ بجے راہی ملک بقا ہوئے۔ لاش ٹھرائی گئی۔ اسی دن ۵ بجے شام جنازہ اٹھا اور انھیں بہادر شاہ ظفر مارگ پر کوئٹہ فیروز شاہ کے قریبی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں ان کی شادی سوائمہ (ضلع الہ آباد) کے بخشی محمد احمد مرحوم کی صاحبزادی رابعہ خاتون سے ہوئی تھی۔ اپنے پیچھے سات بچے چھوڑے: پانچ بیٹیاں (نسرین، پروین، یاسین، تزین، شیرین) اور دو بیٹے (انجم، انور)۔ حکومت ہند نے سلام مرحوم کی دیرینہ خدمات کے پیش نظر خاندان کو تین ہزار روپے یکمشت عطا کیے، اور دو سو روپیا امانت و طیفہ مقرر کر دیا۔

سلام کے کلام کی فضا رومانی ہے۔ وہ بڑے "آدرش وادی" اور محبِ وطن تھے۔ اسی لیے بعض حلقوں میں وہ مدّتوں "شاعرِ رومان" کے لقب سے مشہور رہے۔ نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

آسمان اب بھی تجھے ہم پہ یقین ہے کہ نہیں  
دیکھ جنت سے بھی لکش یہ زمیں ہے کہ نہیں!

زہرہ ہند بہ ایں حسنِ شعورِ تزیین  
آج پہلے سے بھی کچھ اور حسین ہے کہ نہیں!

پانوں میں "راس کھاری" کی سہانی پازیب  
 کھیتیاں کھکشاں کی مہر و خورشید کے باغ  
 "کاشمیر" صورتِ افشاں بجبیں ہے کہ نہیں!  
 رشکِ فردوس ہمارے یہ زمیں ہے کہ نہیں!  
 وہ سکونِ دلِ بیتاب ہیں ہے کہ نہیں!  
 وہی مستقبلِ مشرق کا امین ہے کہ نہیں!

ذرفشاں ہوتے ہوئے آکھوں منزل میں سلام!

اور کھی پرچم سرِ زنگ "حسین" ہے کہ نہیں!

لاکھ انگریزی لو، اب چاند کو چھونے کے لیے  
 یوں تو کھلے بھی ہیں، ہنستے بھی ہیں گلزار میں کھول  
 خود تو کھلنے سے رہے بندِ قبا میرے بعد  
 کوئی طوفانِ بہاراں نہ اٹھا میرے بعد  
 لے تقاضے غمِ دہر! میں کیسے آؤں  
 میں خزاں میں بھی پرستار رہا ہوں اس کا  
 موسمِ گل میں چمن زار کو کیسے چھوڑوں  
 آج تو شمعِ ہواؤں سے یہ کہتی ہے، سلام!  
 لذتِ دردِ غمِ یار کو کیسے چھوڑوں  
 رات بھاری ہے، میں بیمار کو کیسے چھوڑوں

دور ہو دنیا سے میری، یاد بکھو بکھا لو، سیر کرو  
 اس میں اُبڑے جنگل بھی ہیں اور حسین نظارے بھی  
 میرے دل کی رنگیں راتیں، میرے دل کے غمگین دن  
 جلوہ فگن ہیں داغ بھی اس میں، روشن چاند ستارے بھی  
 جی میں آئے، رو سکے ہو! جی میں آئے، ہنس بھی لو  
 یاں موتی کی لڑیاں بھی ہیں اور آنسو کے دھارے بھی  
 چاہوں یہ آکاش سجادوں، چاہوں، اس کو کچھونک بھی لو  
 دوڑ رہی ہے برقِ تپش بھی، کھیل رہے ہیں تارے بھی  
 چاہے بڑھتی پینگیں دیکھو! چاہے آکر سوگ کرو  
 آنسو کی ساون رت بھی ہے، الفت کے ہوارے بھی  
 چاہے، دیپکِ راگ سناؤں، چاہے چھڑوں پریم کے گیت  
 دل میں دکھ کے مارے بھی ہیں، پہلو میں ہپارے بھی

میری دنیا، کیسی دنیا، کیا جانا اس دنیا کو!  
اس میں دکھ کے آنسو بھی ہیں، اس میں چاند ستارے بھی

جاگ رہا ہوں نیند میں، آنکھ کھلیگی بعد مرگ  
ہیں میں آہ! کب شادی و غم مدغم نہیں

اللہ اللہ! وسعتِ ذوقِ نگاہ! ایک عالم پر گمانِ جلوہ گاہ

بجز کو شوقِ بیانِ حالِ فراق ان کو نہ فسانہٴ دل سے

ہنت، اے شوق! اور چار قدم ہو رہا ہوں قریب منزل سے

ذمہ مرا جو جانِ تصور بنا نہ دوں

میرے تصورات کو کچھ آسرا تو دو

ذیل کی غزل انھوں نے آپریشن سے ایک دن پہلے ۱۲ نومبر ۱۹۷۳ء کو کہی تھی

یہ غالباً ان کا آخری کلام ہے:

وہ چشمِ ناز مری سمت یوں اکھی ہے کہ ہاے!

اک ایسی چوٹ دلِ زار پر لگی ہے کہ ہاے!

کبھی ہنسنا ستھارِ رخِ گل پہ دیکھ کر شبِ بنم

ابھی تلک مری پلکوں پہ وہ نمی ہے کہ ہاے!

تمام شہر بظاہر حسین ہے، لیکن

تمام شہر میں کچھ ایسی بے بسی ہے کہ ہاے!

مجھے بھی دیکھ کے محفل میں یوں تو ہیں، مغرور

بظاہر ایسا اک اندازِ بیخوشی ہے کہ ہاے!

میں چھڑتا تو ہوں ہر بار اک نیا نغمہ

صدائے ساز کچھ ایسی دبی دبی ہے کہ ہاے!

وہ اور ہونے کے چھین سیکدہ مبارک ہے

مرے لیے تو وہ انجامِ میکشی ہے کہ ہاے!

یہی کہا تھا کہ تم شہرِ دل کی ملکہ ہو  
بس اتنی بات پہ کچھ ایسی برہمی ہے کہ ہاے!  
تمام شہر میں ہے شورِ انقلاب، سلام!  
تمام پہروں پہ ایسی فسردگی ہے کہ ہاے!

مرحوم کبھی کبھار فارسی میں کبھی کہہ لیتے تھے۔ ان کے کلام میں ہندستان کے دوسرے فارسی  
گویوں سے کچھ ماہہ الامتیاز نہیں ہے! لیکن چونکہ یہ غزل اسفہوں نے ایک موقع پر مجھے دی تھی  
میں اس خیال سے اسے یہاں نقل کر رہا ہوں کہ محفوظ ہو جائے:

بہارِ گلستاں آمد، نشاطِ قلب و جاں آمد	ز ہر سو، زو جِ کبک و سار و قمری نغمہ خواں آمد
بیاغ و راع و کوہ و دریا عباستانہ می رقصد	بشاخِ گلستاں، بنگر، عرار و عینمراں آمد
نب جو، جامے بر کف، قدح نوشے خرد سوز	بستی: بجز از خویشتن، نعرہ زناں آمد
کتاب و حکمت و دانش، ہمہ را سوختہ ہیں ستا	نہی بینی کہ واعظ ہم، سرِ دیرِ مغان آمد
چہ آتش ہا بر افروزد، بہ صحن گلشنِ لالہ	جنون پاگو بند و رقصد، خرد آزر دہ جاں آمد
چہ عہد پر نشاط آمد، چہ دور انبساط آمد	براتِ عاشقان بر شاخِ آہو، شادیاں آمد
نسیم صبح پڑاں شد، نسیم گل شتاباں شد	ہمی گرد و بسکسر ہر کہ این جا سرگراں آمد

## تاب حیدرآبادی، عبداللہ بن احمد

حیدرآباد کے مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ ۱۹۳۱ء جون ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام احمد تھا، جس سے یہ ابن احمد کہلائے۔ ان کا متوسط الحال عرب خاندان تھا۔ سقیم حالات کے باعث ابن احمد اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔ مدرسہ نظامیہ اور کاسٹھ پاٹھ شالائیں کچھ پڑھا اور کچھ کسب معاش کے لیے بلدیہ حیدرآباد میں ملازمت اختیار کر لی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق عنفوانِ شباب سے تھا۔ عمر عزیز مشکل سے ۱۵ برس کی ہوگی کہ شعر کہنے لگے۔ بلکہ اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۳ء میں انھوں نے خود ایک ہفتہ وار اخبار "اردو" جاری کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے محض شوق تو کفالت نہیں کرتا؛ اس کے چلانے کے لیے جتنا روپیہ درکار تھا، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ سال بھر کے اندر پرچہ بند ہو گیا۔

ابتداء میں تخلص آوارہ کیا اور حیدر پاشا حیدر سے مشورہ رہا۔ بعد کو دکن کے مشہور استاد بہو دلی صفی اور رنگ آبادی (ف مارچ ۱۹۵۴ء) کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ کلام بھی اچھا تھا اور پڑھتے بھنی خوب تھے؛ ان کے ترنم میں سوز کا پہلو نمایاں تھا، جو ان کی زندگی کے ناسازگار ماحول اور ناموافق حالات کا آئینہ دار تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے ہار نہیں مانی، نہ کبھی مایوسی کا اظہار کیا۔ حیدرآباد کے ترقی پسند حلقوں میں انھیں ممتاز مقام حاصل تھا، بلکہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش کی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی تھے۔

ان کے کلام کا مختصر انتخاب "خامہ دل" کے عنوان سے ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد نے مئی ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں نظمیں بھی ہیں، اور غزلیں بھی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ



ان کا کلام زندہ رہنے کا مستحق ہے۔ اگر حیات و فاکرتی، تو وہ یقیناً اور بھی ترقی کرتے۔  
 وفات کے بارے میں دو بیان ہیں پہلا یہ کہ وہ شب بھر کہیں پیتے رہے ۲۲۱ نومبر ۱۹۷۳ء  
 علی الصباح نئے میں چور مکان واپس آ رہے تھے کہ گھر کے قریب گرے اور جان بحق ہو گئے۔  
 دوسرا بیان یہ ہے کہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۳ء علی الصباح وہ گھر سے سیر کو باہر نکلے۔ تھوڑی ہی  
 دور گئے تھے کہ قلب پر شدید حملہ ہوا اور پیشتر اس کے کہ کوئی مدد کو پہنچ سکے، جان بحق  
 ہو گئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا، اور اعزہ اور اجاب کے جم غفیر نے اسخیں درگاہ حضرت  
 عبداللہ شاہ صاحب کے احاطے کا مانی پورہ، دودھ باولی میں سپرد خاک کر دیا۔  
 اولاد جسمانی میں چار لڑکے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑی۔

یہ احتیاط کا عالم بھی کیا تیار تہے پکار بھی نہ سکے، تجھ کو تیرے نام سے ہم  
 نہیں نصیب میں نورِ سحر، تو غم بھی نہیں مگر چراغ کی صورت، جلے ہیں شام سے ہم

محفل کی حد تک، ہوتی ہے بات چراغِ محفل کی  
 اور چراغِ راہ کے چرچے منزلِ منزل ہوتے ہیں  
 کہ دوہننے والوں سے، ہر خوشی کی حد غم ہے  
 کوئی رہ نہیں سکتا غم سے بخبر ہو کر  
 جب سے دل کی دھڑکن میں، درد ہو گیا شامل  
 زندگی نظر آئی، اور معتبر ہو کر

حرم کی، دیر کی راہوں سے ہو کے گزرا ہوں تری گلی سے مگر آج تک گزر نہ سکا  
 حرم کی، دیر کی راہوں پہ چل تو سکتے ہیں مگر نصیب کہاں تیری رہ گزار ابھی!  
 نہ تھی تو فیتن جن کو، تاب، اپنے زخم دھونے کی

وہ ہاتھ اب بڑھتے بڑھتے دامنِ قاتل تک آپہنچے

بقدر نور تو شمعِ شبستان خوب ہے، لیکن چراغِ رہگذر کی روشنی کچھ اور ہوتی ہے  
 بحدِ گلستاں، گل کا تبسم دیکھنے والو! گلِ دشت آفریدہ کی ہنسی کچھ اور ہوتی ہے  
 ہمارا دل بھی ہے اک خانہ خدائے شیخ! مگر یہ دل کسی دیوارِ دور کا نام نہیں

حرم سے، دیر سے کچھ راستے تو ہیں منسوب یہ راستے تو تری رگنڈر کا نام نہیں  
 مقام دوست سے آگے ہے منزل غم دوست مقام دوست ہی ختم سفر کا نام نہیں  
 راہوں کی دلاویزی اکثر مجبور سفر کر دیتی ہے  
 منزل پہ پہنچ کر بھی کتنے آسودہ منزل ہونہ سکے

# اشاریہ

## ۱۔ اشخاص

(کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحے پر یہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے )

۲۲، ۲۱۸، ۲۱۷	احسن مارہروی، علی احسن	۹۷	آرزو، مختار الدین احمد
۲۳۰	احمد (عرب)		آغا ججو شرف، دیکھیے شرف آغا ججو
	احمد بخش، ابر حسی : دیکھیے ابر حسی گنوری		آفتاب احمد جوہر : دیکھیے جوہر، آفتاب احمد
	احمد حسن شوکت میرٹھی : دیکھیے شوکت میرٹھی		آمنہ خاتون عفت : دیکھیے عفت،
۲۲	احمد زاہد (سید)		آمنہ خاتون
۱۸۱	احمد علی		
۸۳	احمد طاہر	۲۱۶	ابر حسی گنوری، احمد بخش
۱۹۹، ۱۹۸	اختر حمید رآبادی، سردار بیگم	۲۱۹، ۲۱۸	
۳۴	اختر شیرانی	۱۰۰، ۹۹	ابو جعفر رضوی
۲۲۰	ارتضیٰ حسین عابدی		ابو محمد عیش، دیکھیے عیش، ابو محمد
	ارشاد علی کیف محمود آبادی : دیکھیے	۲۲	ایم خیر آبادی، امیر احمد
	کیف محمود آبادی	۲۵، ۲۴، ۲۳	
۱۷	ارشاد مختار نوری	۹۹	اقشام حسین پرویسر
۱۰۵	ارشاد حسین	۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰	
۲۵	اسیر انصاری، جمال الدین	۳۴	احسان دانش

۴۳ :	اندر یاس	۱۹۰ :	اشپرننگ
۱۰۰ :	انصار حسین	۸۴ :	اصغر حسین (سید)
۲۲۷ :	انوار حسین (حکیم)		اظہار احمد کمالی؛ دیکھیے کمالی، اظہار احمد
۲۲۶ :	انور (پسر سلام)	۱۰۴، ۱۰۱ :	اعجاز حسین، پروفیسر سید
۸۱ :	ایمرن (ہربرٹ)، لفٹنٹ گورنر	۵۲ :	اعجاز صدیقی
			افسر حسین انسر گٹوری؛ دیکھیے افسر گٹوری
۱۹۰، ۱۷۹ :	باقی ظہیر	۲۱۸ :	افسر گٹوری، افسر حسین
۴۰ :	باقی صدیقی، محمد افضل	۹۱ :	افضل امام، خواجہ
۷۴ :	بابو، سلطان	۱۹ :	اقبال (علامہ)
۲۰۱ :	بحر و محبوب (راجا محمد امیر احمد خان)		اقبال احمد خان سہیل؛ دیکھیے سہیل
۲۰۵، ۲۰۲		۱۰۰ :	اقدار حسین
۶۸ :	برتر، نادر علی	۱۹ :	اکرام علی صفوی
۱۱۱، ۳۴ :	بشیر احمد، میاں	۵۱ :	الم مظفرنگری
۱۹، ۱۸ :	بشیر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم		انتیاز علی تاج؛ دیکھیے تاج، انتیاز علی
	بشیر النساء بیگم؛ دیکھیے بشیر حیدر آبادی		امجد حسین امجد؛ دیکھیے امجد حیدر آبادی
۵۸ :	بشیرہ (زوجہ ظفر)	۱۹۴ :	امجد حیدر آبادی، امجد حسین
۲۱۴ :	بگٹا عظیم آبادی، غلام دستگیر خان	۴۲ :	امیر پینائی
	بلقیس جمال؛ دیکھیے جمال و جمیلہ		امیر احمد اشیم؛ دیکھیے اشیم خیر آبادی
	بنے بھائی؛ دیکھیے سجاد ظہیر	۱۹۸ :	امیر حسن، سید
۱۹۰ :	بوٹرو		امیر حیدر خان (مہاراج کمار محمود آباد)؛
۲۰۲ :	بہادر شاہ	۲۰۲	
۱۹۴ :	بھاگیما (بنت جذب)	۱۸۸، ۱۷۲، ۷۹ :	امیر خسرو
۱۶۴ :	بہاء الدین قاری	۲۲۶ :	انجم (پسر سلام)

تہذیبی حیات الحق : ۱۹۱	پہرہ علی صغی، دیکھیے صغی اور رنگ آبادی
۹۳، ۹۲	
۴۳ :	۱۸۲ :
	پروہود سین گیتا
	۲۱۴ :
	پرویز شاہدی
۸۵ :	۲۲۶ :
	پروین (بنت سلام)
	۱۹۴ :
	پر بلا دراد (پسر جذب)
۱۰۵ :	۱۰۱ :
ثریا (بنت اقتشام حسین)	پریم چند
	۷۷ :
	پنہاں بریلوی، سپہ آرا خاتون
جافر حسن، دیکھیے جعفر حسن	
۱۷ :	۲۳۰ :
جاوید (پسر عادل)	تاب حیدر آبادی، عبداللہ بن احمد
۱۹۴، ۱۹۳ :	۲۱۹، ۲۱۸ :
جذب عالمپوری، راگھوندر راؤ	تابش، طریقت حسین
۱۰۵ :	۱۸۲ :
جعفر اقبال (پسر اقتشام حسین)	تائیر، محمد دین
۱۶۱ :	۱۹۲ :
جعفر حسن (جافر حسن)	تاج، امتیاز علی
۱۰۵ :	۴۹، ۴۸ :
جعفر عباس (پسر اقتشام حسین)	تاج قریشی، محمد تاج الدین
۱۰۵ :	۱۴۴ :
جعفر عسکری ( " )	تاج محمد خان
۱۹۴ :	۱۱۱ :
جگر بریلوی	تبسم، غلامی مصطفیٰ، صوفی
۷۷ :	۹۱ :
جمال و جمیلہ، بلقیس جمال	تپاں، نور الحق
جمال الدین اسیر انصاری، دیکھیے اسیر انصاری	ترسون زادہ
۲۱۴ :	۱۸۵، ۱۸۴ :
جمیل منطہری	ترکی، غلام محمد
۲۰۲ :	۲۲۶ :
جنّاح، محمد علی	تزیین (بنت سلام)
جوہر لال نہرو، دیکھیے نہرو، جوہر لال	۱۷ :
۱۸۱ :	تسلیم (بنت عادل)
	تقی حسن وفا، دیکھیے وفا، تقی حسن
۳۴، ۳۳ :	۱۶۱ :
جوش ملیح آبادی	تلسی داس



حمیدناگپوری، عبدالحمید : ۱۴۵، ۱۴۴ :	۲۰۳۱	جوشی، پی سی
حمید اللہ خان (والی بھوپال) : ۸۲ :	۱۷۰ :	جوہر، آفتاب احمد
حیات الحق محمد محی الدین، دیکھیے تمنا غامری	۱۹۴ :	جے دیوی
حیدر پاشا، حیدر : دیکھیے حیدر، حیدر پاشا	۱۸۲ :	جوتی گھوش
حیدر، حیدر پاشا : ۲۳۰ :		
چراغ حسن حسرت : دیکھیے حسرت، چراغ حسن		
خلیل احمد شمیم، دیکھیے شمیم، خلیل احمد	۱۹۸ :	چراغ علی (اعظم یار جنگ)
داغ : ۱۹۸، ۲۱۷ :	۹۵ :	حافظ
داؤد خان : ۲۰۱ :	۸۱، ۸۰ :	حالی
دین محمد، شیخ : ۱۱۱ :	۲۰۲ :	حبیب اللہ، ڈپٹی
ڈیوٹ، مبارک حسین، سید : ۲۰۵ :	۹۷ :	حزین
ذاکر حسین، ڈاکٹر : ۲۳ :	۱۱۲ :	حسرت، چراغ حسن
ذکی عبدالقادر : ۲۰۴ :		حسن آرا بیگم : دیکھیے غزالہ
ذوق : ۶۸ :	۱۸۹، ۱۷۹ :	حسن ظہیر
رابعہ خاتون (زوجہ سلام) : ۲۲۶ :	۱۰۱ :	حسن عسکری، میر
راجا (بنت جذب) : ۱۹۴ :	۱۸ :	حسن نظامی
راجندر پرشاد (بابو) : ۹۲ :	۵۲ :	حسین احمد مدنی
راہل ہوشیار پوری، عبدالرشید : ۱۱۰ :	۲۸ :	حسین اصغر
رادھا کرشنن، صدر جمہوریہ : ۱۰۶ :	۱۸۹، ۱۷۹ :	حسین ظہیر
	۲۱۸ :	حشر، محسن علی
		حفیظ ہوشیار پوری، عبدالحفیظ سلیم :
	۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۸ :	

بیجان اللہ خان گورکھپوری : ۲۳، ۲۳	۲۱۷، ۲۱۷	راز سہسوانی
سبکتگین، ناصر الدین : ۲۲	۱۹ :	راشد علی صفوی
سجاد ظہیر، سید : ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱	۱۹۳ :	رام راؤ، پنڈت
۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶	۱۹۳ :	رام نرسو، پنڈت
۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۳-۳	۱۷۱ :	رحیم (خانانا)
سنا شاہ بھوپوری، سخاوت حسین : ۲۱۶	۱۷۰ :	رخشاں، مطبع احمد
۲۱۷	۱۸۱ :	رشید جہان
سخاوت حسین سخا، دیکھیے سنا شاہ بھوپوری	۱۸۹ :	رضا حسین، سید
سخا دہلوی، نظیر حسن : ۱۹۲	۱۷۰ :	رضی، رضی احمد
سخی حسن امر دہری، سید : ۸۵، ۸۲		رضی احمد، رضی : دیکھیے رضی، رضی احمد
سراج الدین ظفر : دیکھیے ظفر، سراج الدین	۸۸ :	رضیہ بانو
سرور خان صبا : دیکھیے صبا، سرور خان	۱۸۹ :	رضیہ سجاد ظہیر
سعدی : ۹۵		رفیع احمد عالی : دیکھیے عالی، رفیع احمد
سعیدہ دہنت اقصام حسین) : ۱۰۵	۲۳ :	رنگین، ہری ہردت سنگھ
سفیر الحق عمادی : ۹۱	۱۰۶ :	روین رولاں
سگن بی بی : ۱۷۹	۲۳، ۲۴ :	ریاض خیر آبادی
سکینۃ الفاطمہ بیگم : دیکھیے سگن بی بی		
سلام مچھلی شہری، عبدالسلام : ۲۲۲	۱۰۰ :	زاہد النساء بیگم
سلمان الارشد : ۱۷	۱۹، ۶۹ :	زور، محی الدین قادری
سایم پاتی پتی، وحید الدین : ۸۱	۱۸۲ :	زیڈ. اے. احمد (زین العابدین احمد)
سہیل، اقبال احمد خان : ۲۳	۶۸ :	زیرک، علی احمد
سید ابانی، ششویٹی : ۱۹۳	۲۲ :	زین العابدین سجاد (امام)
سید احمد خان (سر) : ۸۱	۵۷ :	زینب عبدالقادر (سنر)

- ۲۳ : صبا، سرور خان
- ۲۱۸۱ : صغیر حسنی مظفر ننگری
- ۷۷ : صغیر علی صوفی
- ۲۳۰ : صفی اورنگ آبادی، بہبود علی
- ۱۲۳ : صنوبر، وارث ناظمہ
- ۱۹ : ضامن علی صفوی غازی
- ضیا احمد ضیا بدایونی، دیکھیے ضیا بدایونی، ضیا احمد
- ۲۱۷، ۱۷۱، ۱۷۰ : ضیا بدایونی، ضیا احمد
- ۲۲ : ضیا اللہ
- ۷۷ : طالب الہ آبادی، طالب علی
- طالب علی طالب الہ آبادی : دیکھیے طالب الہ آبادی
- ۸۷ : طاہرہ کلثوم
- طریقۃ حسین تائبش : دیکھیے تائبش طریقۃ حسین
- ۲۳ : ظفر، محمد یوسف (یوسف ظفر)
- ۵۷ : ظفر، سراج الدین ظفر
- ظفر مہدی گہر : دیکھیے گہر، ظفر مہدی
- ۴۸ : ظہیر دہلوی، نواب مرزا
- ۱۷۲ : ظہیر احمد صدیقی
- ۲۳ : سید ملیحان ندوی
- ۸۴، ۸۵ : سید عابد حسین (ڈاکٹر)
- ۲۱۹، ۷۴، ۵۸، ۵۱ : سیما بابر آبادی
- ۹۴ : شاہ بلاقی حافظ
- ۱۷ : شاہینہ تنویر (بنت عادل)
- ۹۴، ۹۵، ۲۳ : شبلی نعمانی
- ۲۰۵ : شرف آقا جو
- ۸۴ : شرف الدین شاہ ولایت
- شفیع احمد محو، دیکھیے محو، شفیع احمد
- ۱۸ : شمس النساء بیگم
- ۹۵ : شمشاد لکھنوی، عبدالاحد
- ۴۳ : شمیم، خلیل احمد
- ۱۰۱ : شمیم کرمانی
- ۱۷ : شوکت تھانوی
- ۱۹۴ : شوکت میرٹھی، احمد حسن
- ۱۴۴ : شیخ رسول
- ۱۴۵، ۱۴۴ : شیخ علی
- ۲۲۴ : شیریں (بنت سلام)
- صادق حسین غبار : دیکھیے غبار، صادق حسین
- ۱۸ : صادق علی بیگ
- صالحہ بیگم محنتی : دیکھیے محنتی، صالحہ بیگم

عبدالعزیز (بیرسٹر) ۹۳، ۹۲۱	۱۷۹ :	غیر من
عبدالعلیم (ڈاکٹر) ۱۰۴ :		
عبدالغنی (خان صاحب) ۱۹۹، ۱۹۸ :	۱۷ :	مادل رشید
عبدالکریم خان ۲۰۱۲ :	۲۵ :	عارف خیر آبادی، نثار احمد فاروقی
عبدالحمید ۱۱۱، ۱۱۰ :	۲۰ :	عارف ابوالعلائی
عبدالمقدر، مولانا ۱۷۱ :	۲۱۷، ۱۷۶ :	عالی، رفیع احمد
عبدالواحد، ابوظفر ۱۹ :	۱۷۵ :	عائشہ (زوجہ حمید ناگپوری)
عبداللہ بن احمد تاب : دیکھیے	۲۱۹ :	عائشہ بیگم (زوجہ ابر)
تاب حیدر آبادی عبداللہ بن احمد	۸۷ :	عباس بھائی
عثمان غنی (منا) ۱۹۹ :	۷۸، ۷۷ :	عبدالاحد بریلوی
عدم، عبدالحمید ۲۰ :		عبدالاحد شمشاد : دیکھیے شمشاد لکھنوی عبدالاحد
عذرا بیگم (بیگم عادل) ۱۷ :		عبدالحفیظ سلیم حفیظ : دیکھیے حفیظ ہوشیار پوری
عرشی ام ترسی، محمد حسین (حکیم) ۲۱۲ :	۸۱، ۷۶ :	عبدالحق (مولوی، ڈاکٹر)
عزیز لکھنوی ۲۰۲ :	۲۱۷ :	عبدالحکیم گنوری (حکیم)
عزیز الفاطمہ (بنت تمنا) ۹۴ :		عبدالحمید، حمید ناگپوری : دیکھیے حمید ناگپوری
عسکری حسن ۸۴ :		عبدالحمید علام، دیکھیے عدم، عبدالحمید
عظیم اختر (پسریم اختر) ۵۱ :	۸۸ :	عبداللہ
عفت بدایونی، آمنہ خاتون ۷۷ :	۸۱ :	عبدالرحمن
علی، سید ۴۲ :		عبدالرشید راحل : دیکھیے راحل ہوشیار پوری
علی حسن، حسن : دیکھیے حسن مارہروی،		عبدالرشید
علی حسن		عبدالستار صدیقی ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰
علی احمد زیرک : دیکھیے زیرک قنوجی،		عبدالسلام سلام : دیکھیے سلام مچلی شہری
علی احمد		عبدالسلام

۸۸ :	فاطمہ فرخ	۱۸۸ :	علی باقر
۲۸ :	فانی		علی حیدر نظم طباطبائی : دیکھیے نظم طباطبائی،
۹۲، ۹۱ :	فائز، نذیر الحق		علی حیدر
۹۴ :	فائق، محمد امام الدین	۵۰ :	علیم اختر منظر نگری
۱۶۱ :	فخر الحاجیہ	۱۸۹، ۱۷۹ :	علی ظہیر
۹۲ :	فخر الدین (سر)	۹۴ :	علی محی الدین
۱۰۱ :	فدا حسین، میر	۹۶، ۹۱ :	عماد الدین قلندر
۱۸۱ :	فرائد	۱۹۸ :	عنایت اللہ خان مشرقی
۱۱۰ :	فضل محمد خان	۱۰۰ :	عیش لکھنوی، ابو محمد
۵۷ :	فقیر محمد، مولوی		
۲۰۲ :	فیاض حسین کنتوری	۷۸ :	غبار، صادق حسین
۵۸ :	فیروز دین (مولوی)	۷۷ :	غزالہ بریلوی، حسن آرا بیگم
۸۴ :	فیروز شاہ تغلق		غلام دستگیر خان بگٹ : دیکھیے
۱۸۶، ۱۸۵، ۳۴ :	فیض، فیض احمد		بگٹ، غلام دستگیر خان
	فیض احمد فیض : دیکھیے فیض، فیض احمد	۳۳ :	غلام رسول
		۱۱۰ :	غلام محمد، شیخ
۴۶ :	قدسی خیر آبادی		غلام محمد (ترک علی شاہ) : دیکھیے ترکی،
۱۸۵ :	قربان علی خان		غلام محمد
۱۹۸ :	قمر لکھنوی، کریم حسن		غلام مصطفیٰ عموی تبسم : دیکھیے تبسم،
			غلام مصطفیٰ صوفی
۱۰۱ :	کاظمی بانو (زوجہ شمیم کرمانی)	۴۲ :	خملگین، محمد بہری
۱۶۱ :	کبیر	۲۱۹ :	غنی باقر (پیرا)
		۸۴ :	غیاث الدین بلبن



۲۲۲ :	تین پچلی شہری	۱۸ :	کشن پرشاد (ہاراجا)
۱۰۴ :	مجرور سلطان پوری		کریم حسن قمر: دیکھیے قمر لکھنوی،
۹۲، ۹۱ :	مجیب اللہ قادری		کریم حسن
۱۷۱ :	محب اللہ	۱۷۰ :	کمال احمد
۱۹۸ :	محبوب علی	۱۷۲ :	کمالی، انظر احمد
۱۷۵ :	محمد ابراہیم (پسر حمید)	۲۰۵ :	کیف محمود آبادی، ارشاد علی
۸۱ :	محمد ابراہیم، حاجی	۱۰۴ :	کیفی اعظمی
۱۷۱ :	محمد ابراہیم قادری		
۲۲۶ :	محمد احمد بخش	۱۷۲ ، ۱۷۱ :	گاندھی، ہاتما
۸۳ :	محمد احمد، شیخ	۱۷ :	گلریز (پسر عادل)
۲۴ :	محمد اسحاق، حکیم	۱۹۰ :	گل کرست
۸۲، ۸۱، ۸۰ :	محمد اسماعیل پانی پتی	۴۲ :	گوہر تاج
۲۲۴ :	محمد اسماعیل جو پوری	۲۰۳ :	گہر، ظفر ہدی
۱۸۶ ، ۱۸۵ :	محمد اصغر چودھری		
	محمد افضل باقی صدیقی: دیکھیے باقی صدیقی	۱۸۱ :	لارنس، ڈی، ایچ
	محمد امام الدین فائق: دیکھیے فائق،	۶۳ :	لیٹ من
	محمد امام الدین	۱۰۰ :	نحت حسنین
	محمد امیر احمد خان (والی محمود آباد):	۷۴ :	بن یوتانگ
	دیکھیے بحر و محبوب		
۶۸ :	محمد امیر الدین قریشی	۱۹۳ :	ماہوراؤ، پنڈت
۲۰۱ :	محمد امیر حسن (راجا محمود آباد):		مبارک حسین ڈیوٹ: دیکھیے ڈیوٹ
۲۰۵		۹۲ :	مبارک فاطمہ
۹۴، ۹۳ :	محمد انعام الدین (پسر تمنا)	۸۳ :	مبارک محمود، شیخ

محمد بن ابی بکر	۲۰۱ ، ۱۷۰ :	محمد یوسف، یوسف ظفر : دیکھیے
محمد تغلق	۲۰۱ :	یوسف ظفر، محمد یوسف
محمد تقی (خان بہادر)	۸۷ :	محمدی جان
محمد جعفر پھلواری	۹۵ :	محمد والظفر
محمد حسین عرشی : دیکھیے عرشی، محمد حسین		محمد خان
محمد حسین عطا	۱۸۵ :	محمد غزنوی
محمد خواجہ شفیع حسن عارف (ابوالعلانی) :		محمد الدین قادری زور : دیکھیے زور
دیکھیے عارف، ابوالعلانی		محمد الدین قادری
محمد دین تاثیر : دیکھیے تاثیر، محمد دین		مختار الدین مختار صدیقی : دیکھیے
محمد زہیر (پسر عبدالستار صدیقی) :	۴۵ :	مختار صدیقی
محمد سلطان	۰۲۸ :	مختار صدیقی، مختار الدین : ۷۳
محمد عالم، حافظ	۸۶ :	مختار الدین احمد آرزو : دیکھیے آرزو
محمد عبدالرزاق	۲۲۴ :	مختار الدین احمد
محمد عبدالعلیم صدیقی : دیکھیے علیم اختر		مخدوم حسین سید
منظر نگر		مخدوم عالم
محمد عبدالقادر	۵۷ :	محفی، صالحہ بیگم
محمد مسکری و سیم شیر آبادی : دیکھیے و سیم شیر آبادی		مدینہ بیگم (بنت ابر)
محمد علی جناح : دیکھیے جناح، محمد علی		مشیر احمد (پسر اشیم)
محمد علی شہد خان (والی محمود آباد) : ۲۰۱		مصطفیٰ زیدی
۲۰۵ ، ۲۰۲		مصطفیٰ کمال پاشا
محمد قاسم حسین	۱۰۰ :	مطیع احمد رختاں : دیکھیے رختاں،
محمد مسلم (پسر عبدالستار صدیقی) :	۴۵ :	مطیع احمد
محمد مہدی نعلین : دیکھیے نعلین، محمد مہدی		ملک راج انند
		۱۸۲ :

نذیر الحق فائز، دیکھے فائز، نذیر الحق	۱۱۱ :	ممتاز علی سید (شمس الطماہ)
۲۱۹ :		منظور حسین وکیل
۲۲۶ :		منہاج الدین مخدوم جیلانی
۱۷ :		ہر علی شاہ قلندر
۱۸۹ :		موراسکی
۱۸۵ :		موسیٰ بن جعفر (امام)
۲۰۱ :		میر
۲۰۱ :		میرا بابا
نظم طباطبائی، علی حیدر، سید :	۷۴ : ۲۲ :	میراجی
نظیر حسن سخا دلہوی : دیکھے سخا دلہوی	۸۲ :	میراں سید علی بزرگ
نظیری		
۹۵ :		
نفس لکھنوی	۲۳ :	نادر شاہ
۲۰۵ :		نادر علی برتر، دیکھے برتر، نادر علی
نواب ہندی، نواب خان الہ آبادی : ۱۶۶ :		نادرہ (بنت سجاد ظہیر) : ۱۸۹ :
نواب خان نواب ہندی : دیکھے		ناصر رضا ناصر کاظمی : دیکھے ناصر کاظمی،
نواب ہندی		ناصر رضا
نواب علی خان (راجا) : ۲۰۵ ، ۲۰۱ :		ناصر کاظمی، ناصر رضا : ۲۸ :
نواب مرزا ظہیر دلہوی : دیکھے ظہیر دلہوی،		ناطق گللا ڈکھوی، ابوالحسن : ۱۶۶ :
نواب مرزا		نبی بخش : ۲۱۶ :
نور (بنت سجاد ظہیر) : ۱۸۹ :		نثار احمد فاروقی عارف : دیکھے
نور، نور احمد		عارف خیر آبادی، نثار احمد فاروقی
نور احمد نور : دیکھے نور، نور احمد		نجم الحسن رضوی : ۲۵ :
نور الحق تپاں، دیکھے تپاں، نور الحق		نجمہ (بنت سجاد ظہیر) : ۱۸۸ ، ۱۸۹ :
نولڈیک		
۶۳ :		

۱۴۳ :	دفا، تقی حسن	۱۸۷۵، ۱۸۳ :	نہرو، جواہر لال
۹۴ :	ولییہ (بنت تمنا)	۲۲۰ :	نیاز فتحپوری
۱۰۱ :	باشمی بالو (زوجہ اختشام حسین)		دارت فاطمہ : دیکھیے صنوبر سینا پوری
	ہری ہرودت سنگھ رنگین : دیکھیے رنگین	۱۰۰ :	وجاہت حسین
۹۳ :	ہور و وٹنر، جوزف	۱۷۰ :	وجیہہ الدین
۱۸۱ :	ہیرس، فرانک		وحید الدین سلیم پانی پتی : دیکھیے
			سلیم پانی پتی، وحید الدین
۲۲۶ :	یاسمین (بنت سلام)	۸۷ :	وحید الدین احمد
۲۳، ۲۲ :	یحییٰ اعظمی	۲۱۹ :	در لیت حسین (پسر ابر)
۲۶ :	یقین احمد (پسر انیم)	۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹ :	وزیر حسن (سر)
۳۳ :	یوسف ظفر، محمد یوسف	۲۰۲، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲ :	
۱۷۱ :	یونس علی محدث، سید	۲۲۰، ۲۱۳، ۲۱۲ :	وسیم خیر آبادی، محمد عسکری
		۲۶ :	وصی سینا پوری

## ۲ مطبوعات (کتاب و رسائل)

۹۴ :	اصلاح سخن (شوق)	۱۹ :	آہنگِ شعر (بشیر)
۱۴۲ :	اطلاقی سماجیات (جعفر حسن)	۱۹۵ :	آہنگِ جذب (جذب)
۱۰۶ :	اعتبارِ نظر (احتشام حسین)	۵۸ :	آئینے (ظفر)
۹۶ :	افعالِ مرگبہ (تمنا)	۱۶۲ :	ابتدائی نگرانیات (جعفر حسن)
۸۲ :	افکارِ سلیم (سلیم)	۱۹۵ :	احساساتِ جذب (جذب)
۱۰۶ :	افکار و مسائل (احتشام حسین)	۲۱۸ :	احسن (ماہنامہ)
۱۷ :	اشجاء (ماہنامہ)	۱۰۵ :	ادب اور سماج (احتشام حسین)
۲۲ :	امیر اللغات (امیر مینائی)	۱۱۲ :	ادبی دنیا (ماہنامہ)
۱۰۶ :	انتخابِ آبِ حیات (احتشام حسین)	۶۶ :	اردو (تماہی)
۱۸۱ :	انگارے (سجاد ظہیر)	۲۳۰ :	اردو (ہفتہ وار)
۵۱ :	انوارِ حرم (علیم اختر)	۱۰۶ :	اردو ساہتیہ کا اتہاس (احتشام حسین)
۲۸ :	اوراقِ نو	۱۰۶ :	اردو ساہتیہ کا آؤچنا تک اتہاس (۱۰۶)
۹۶ :	ایضاحِ سخن (تمنا)	۱۹۵ :	ارمغانِ جذب (جذب)
۲۲۶ :	باز و بند کھل کھل جائے (سلام)	۷۸ :	اشکِ خونیں (پنہاں)
۲۹ :	برگِ نئے (ناصر کاظمی)	۲۲۰ :	اصلاحِ الاصلاح (ابر)



جوش اور اس کا فن (اختتام حسین): ۱۰۶	۵۱ :	بونے گل (علیم اختر)
جھلک (ماہنامہ) : ۲۵	۲۲۵ :	پائل (سلام)
جینے کی اہمیت (لن یوتانگ) : ۷۴	۱۹۲ :	پروانہ (ماہنامہ)
حوائق الحنفیہ (فقیر محمد) : ۵۷	۱۸۷ :	پگھلا نیلم (سجاد ظہیر)
حرفِ خاموش (حمید) : ۱۴۶	۲۹ :	پہلی بارش (ناصر کاظمی)
حیات (ہفتہ وار) : ۱۸۷	۱۱۲، ۱۱۱ :	پھول (ہفتہ وار)
حیاتِ نو (ماہنامہ) : ۸۲	۵۱ :	پھول پتے (علیم اختر)
خامہ دل (تاب) : ۲۳۰	۸۴ :	تاریخِ اصغری (اصغر)
خزینے (ابر) : ۲۲۰	۴۹ :	تاریخِ دکن (منظوم)
خطوطِ زنداں (سجاد ظہیر) : ۱۸۷	۱۷۳ :	تجلیات (ضیاء)
خندانہ کھن (جذب) : ۱۹۵	۱۹۵ :	تحفہ جذب (جذب)
دستورِ الاصلاح (سیماب) : ۲۱۹	۷۲۲، ۷۲۳ :	تحفہ خوشتر (ماہنامہ)
دیوان (ناصر کاظمی) : ۲۹	۱۷۳ :	تذکارِ سلف (ضیاء)
دیوانِ بیان (بیان) : ۶۷	۸۲ :	تذکرہ حالی (محمد اسماعیل)
دیوانِ فائز (فائز) : ۹۱	۱۹۹ :	تضمینِ اقبال (اختر)
دیوانِ مومن مع شرح (ضیاء) : ۱۷۳	۱۰۵ :	تنقید اور علی تنقید (اختتام حسین)
ذوقِ ادب اور شعور (اختتام حسین) : ۱۰۵	۱۰۵ :	تنقیدی جائزے ( " )
راہبہ (مسز عبدالقادر) : ۵۷	۱۰۶ :	تنقیدی نظریات ( " )
راہ و منزل (ہفتہ وار) : ۴۰	۱۱۲ :	تہذیبِ نسواں (ماہنامہ)
رباعیاتِ جذب (جذب) : ۱۹۵	۸۱ :	جامِ جہاں نما (ماہنامہ)
رسالہ تذکیر و تائینٹ (تمنا) : ۹۶	۸۸ :	جذباتِ مخفی (مخفی)
روایت و لغات (اختتام حسین) : ۱۰۵	۱۷۳ :	جلوہ حقیقت (ضیاء)
روشنائی (سجاد ظہیر) : ۱۸۷	۵۸ :	جنتِ ایکسپریس (ظفر)

- ۱۰۶ : عکس اور آئیٹے (اقتشام حسین)
- ۱۹۲ : عمرانیات اور مسئلہ تعلیم (جعفر حسن)
- ۱۸۷ : عوامی دور (ہفتہ وار)
- ۵۸ : غزالِ غزل (ظفر)
- غالب اور انیس : ایک تقابلی مقابلہ
- ۱۴۳ : (جعفر حسن)
- ۱۷۳ : قصائد مومن مع شرح (ضیا)
- ۱۷۳ : قولِ سدید (ضیا)
- ۱۸۹ ، ۱۸۳ : قومی جنگ (ہفتہ وار)
- ۲۳ : کابل (ماہنامہ)
- ۲۵ : کارواں (ماہنامہ)
- ۱۴۳ : کارنامہ انیس (جعفر حسن)
- ۸۱ : کائنات (ماہنامہ)
- ۹۴ : کربل کتھا (فضلی)
- ۱۰۶ : کلکی (اقتشام حسین)
- ۳۴ ، ۳۳ : کلیم (ماہنامہ)
- کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟
- ۱۷۳ : (ضیا)
- ۵۱ : گل بوئے (علیم اختر)
- ۴۳ : گلچیں (گلدستہ)
- ۱۰۶ : گنجی کی کہانی (اقتشام حسین)
- ۵۷ : لاشوں کا شہر (مسز عبدالقادر)
- ۱۷۳ ، ۱۷۰ : لمحات (رضی)
- ۱۰۶ : روشنی کے درپے (اقتشام حسین)
- ۲۲۰ ، ۲۱۹ : رہنمائے تعلیم (ماہنامہ)
- ۱۴۲ : زرعی افلاس ہند سماجیات (جعفر حسن)
- ۵۸ : زمزمہ حیات (ظفر)
- ۱۸۶ : زنداں نامہ (فیض)
- ۱۰۵ ، ۱۰۳ : ساحل اور سمندر (اقتشام حسین)
- ۱۹۵ : سازِ غزل (جذب)
- ۱۸ : ساقی (ماہنامہ)
- ۵۷ : سراج الاخبار
- ۱۷۶ : سفرنامہ روس (اقتشام حسین)
- ۲۲۰ : سفینے (ابر)
- ۱۷۳ : سمن زار (ضیا)
- ۹۶ : سیدھا راستہ (صراطِ مستقیم)
- ۵۱ : شبستان (ماہنامہ)
- ۲۲۰ : شبینے (ابر)
- ۱۹۴ : شجرہ ہند (ماہنامہ)
- ۵۱ : شمع (ماہنامہ)
- ۱۹۹ : صحیفہ درخشاں (اختر)
- ۵۷ : صدائے جرس (مسز عبدالقادر)
- ۸۲ : عالمگیر (ماہنامہ)
- ۸۸ : عبرت (ہفتہ وار)
- ۸۱ : عصمت (ماہنامہ)
- ۸۱ : عروج (ہفتہ وار)

۵۱ :	نکبت گل (علیم اختر)	۱۸۱ :	لذت کی ایک رات (سجاد ظہیر)
۲۲۰ :	نگار (ماہنامہ)	۸۰ :	نوریاں اور پہیلیاں (محمد اسماعیل)
۲۲۰ :	نگینے (ابر)	۱۷۳ :	مباحث و مسائل (ضیاء)
۸۵ :	نمک پارے (سیدنی حسن)	۹۶ :	مذہب و عقل (تمنا)
۱۱۲ :	نمکدان (ہفتہ وار)	۱۷۳ :	مسائل و منازل (ضیاء)
۲۳ :	نوائے حیات (بچی اعظمی)	۸۱ :	مشعل (ماہنامہ)
۲۳ :	نوائے عصر ( " )	۲۲۵ :	مفراب (ماہنامہ)
۲۲ :	نور اللغات	۲۳ :	معارف (ماہنامہ)
۸۵ :	نئی روشنی (ہفتہ وار)	۹۶ :	معاش و معاد (تمنا)
۸۸ :	نیاشاہکار (مخفی)	۱۹۵ :	مطوبات جذب (جذب)
۵۷ :	وادی قاف (مسز عبدالقادر)	۸۲ :	مقالات سرسید (محمد اسماعیل)
۲۲۵ :	وسعتیں (سلام)	۸۲ :	مکاتیبِ حالی
۱۰۶ :	دو یگانہ (احتشام حسین)	۱۷۳ :	مکتوبات (ضیاء)
۱۰۵ :	دیرانے (احتشام حسین)	۸۲ :	مکتوبات سرسید (محمد اسماعیل)
۱۶۲ :	ہماری ریلیں اور سڑکیں (جعفر حسن)	۱۶۱ :	منتجات ہندی کلام
۱۱۱ ، ۲۸ :	ہمایوں (ماہنامہ)	۷۲ :	منزلِ شب (مختار)
۵۸ :	ہندستانی (تماہی)	۲۲۰ :	میری اصلاحیں (ابر)
۱۶۲ :	ہندستانی سماجیات (جعفر حسن)	۲۲۵ :	میرے نغمے (سلام)
۱۸۷ :	ہندی، ہندستانی (سجاد ظہیر)	۶۷ :	نامہ غالب
۱۷۳ :	یادگارِ عالی (عالی)	۱۸ :	ناہید (ماہنامہ)
		۲۲۲ :	نغمہ (ماہنامہ)

مکتبہ : بدیع الرحمن قاسمی

۲۸ فروری ۱۹۷۶ء



# نئی اور اہم مطبوعات

۱۸/۵.	ڈاکٹر گیان چند	رموز غالب
۲/۰	صالحہ عابد حسین	میر انیس سے تعارف
۱۰/۵.	جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی منکرین
۱۵/۰	ڈاکٹر محمد حسن	جدید اردو ادب
۱۲/۰	علی خواجہ زبیدی	فکر و ریاض
۱۴/۰	آئنہ نرائن ملا	کچھ نثر میں بھی
۱۱/۰	کبیر احمد جاسی	بازگشت
۱۵/۰	محمود الحسن	دوبوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا
۱۷/۵.	مرتبه: عبداللطیف اعظمی	مشابیر کے خطوط
۲/۰	رشید حسن خاں	اردو کیسے لکھیں
۲/۰	مرتبه: محمد ذاکر	نیا اردو نصاب (اول)
۳/۰	مرتبه: قیصر زبیدی، محمد ذاکر	نیا اردو نصاب (دوم)
۴/۰	جان نثار اختر	پچھلے پہر
۱۲/۰	سکندر علی وجد	بیاض مریم
۲۲/۰	ضیاء احمد بدایونی	مسالک و منازل
۲/۰	سید نور الحسن	مغلیہ ہندستان میں زرعی تعلقات
۲/۰	رام شرما	سامی تبدیلیاں ازمنہ و سہلی کے ہندستان میں
۲/۵.	مالک رام	قدیم دلی کا لچ
۶/۵.	مرتبه: سفارش حسین رضوی	انتخاب عالی
۱۸/۰	عتیق صدیقی	یادوں کے سائے
۱۱/۰	نثار احمد فاروقی	تلاش میر
۵/۵.	غلام ربانی تاپا	ہوا کے دوش پر
۲/۰	ضیاء الحسن فاروقی	جدید ترکی ادب کے ارکان تلاش
۴/۵.	ڈاکٹر مشیر الحق	مذہب اور جدید ذہن
۹/۵.	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب اور شاہانِ تیموریہ
۱۶/۰	پروفیسر محمد مجیب	نگارشات
۱۸/۰	صالحہ عابد حسین	جانے والوں کی یاد آتی ہے
۱۲/۵.	آل احمد سرور	مسرت سے بصیرت تک
۱۰/۰	مالک رام	دہ سو برس الہی
۱۰/۰	مہر محمد خاں شہاب المیر کوٹلوی	دین الہی اور اس کا پس منظر
۱۲/۵.	آل احمد سرور	نظر اور نظریے
۹/۰	رشید احمد صدیقی	ہمارے ڈاکٹر صاحب
۱۰/۵.	رشید احمد صدیقی	طنزیات و مضحکات

برلن آرٹ پریس ریپروڈیوٹرز، کتب خانہ جامعہ لیسٹن، ٹیوڈی ہاؤس دریا گنج دہلی